حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ

الفضل آن لائن کے اوراق سے



ادارہ الفضل آن لائن لندن



سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ

(الفضل آن لائن کے اوراق سے)

مضمون نگار: ہادی علی چوہدری

مرتبہ: محمد انور شہزاد

ادارہ الفضل آن لائن لندن

ادارہ الفضل آن لائن کی 46 ویں کاوش

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

رابطہ کرنے کے لیے

ویب سائٹ: www.alfazlonline.org

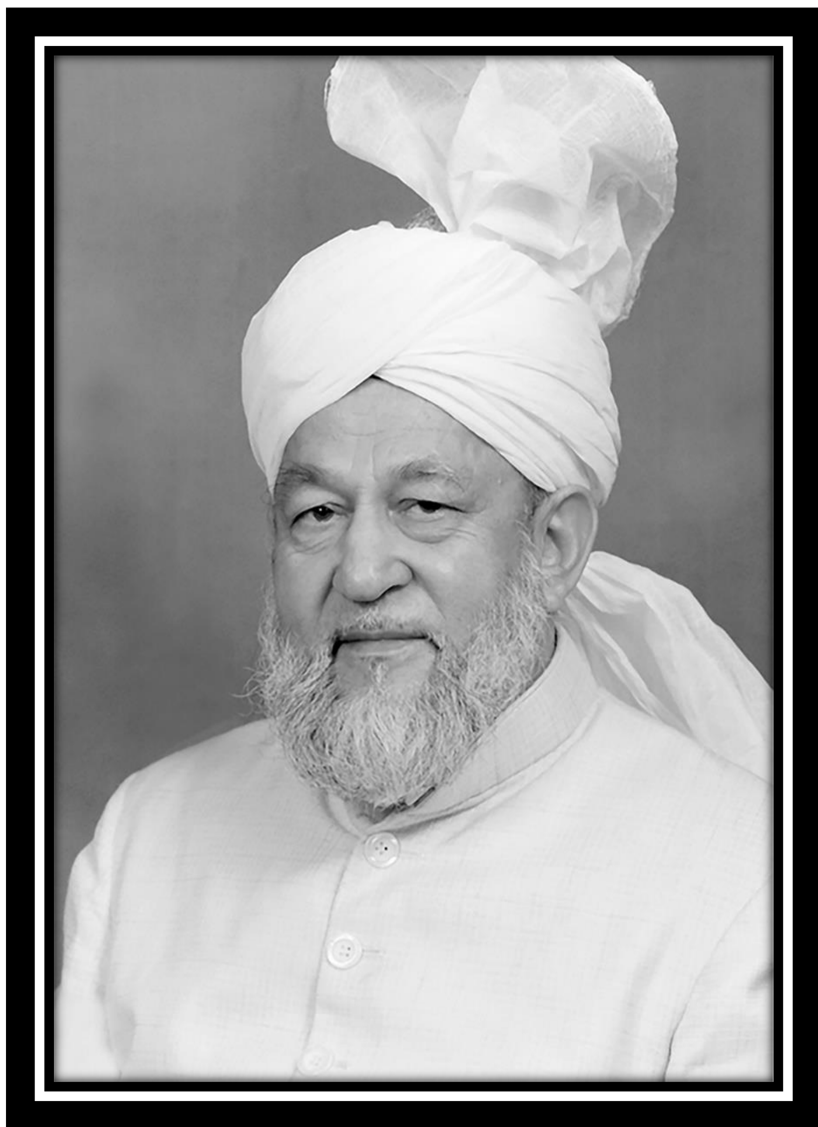
ای میل ایڈریس: info@alfazlonline.org

editor@alfazlonline.org

فون نمبر: +44 7951 614020

+44 7376 159966

آن لائن ایڈیشن



حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

پیدائش:1928ء وفات:2003ء

مکرم ہادی علی چوہدری صاحب



مربی سلسلہ و نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا

دیباچہ

خلفاء کی پیاری پیاری حرکتوں، اداؤں اور باتوں کو نوٹ کرنا احباب جماعت کا شروع سے وطیرہ رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں پاکستان سے برطانیہ جلسہ میں شمولیت کے لیے آیا ہوا تھا۔ مسجد فضل لندن میں ایک نماز کی ادائیگی کے بعد مجھے پاکستان سے آئے ایک دوست نے بتایا کہ حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نماز کے بعد دائیں پہلو سے اٹھتے ہیں۔ اس دوست کی یہ بات مجھے کچھ دیر کے لیے اس سوچ میں گرفتار کر گئی کہ حضور کی اداؤں کو ان سے پیار کرنے والے اتنے قریب سے دیکھتے اور عمل کرتے ہیں، شاید اس وجہ سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (بخاری کتاب الاخلاق حدیث نمبر 6168) کہ آدمی اس کے ساتھ ہوتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔

ہم اپنی جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ محاورہ، احباب جماعت پر خلیفۃ المسیح سے محبت کے حوالہ سے پورا اترتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت مکرم ہادی علی چوہدری مربی سلسلہ ونائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا کے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کے متعلق لکھے مضامین سے جھلکتی نظر آتی ہے۔ آپ کو حضور رحمہ اللہ کے ساتھ لمبا عرصہ کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ نے اپنے ذوق کے مطابق اپنے پیارے امام کی علمی اور ادبی قوتوں سے حصہ پایا اور ان کو نوک قلم پر لانے کی کامیاب کوشش کی جو الفضل ان لائن کی زینت بنے۔ ادارہ ان کے لکھے آٹھ مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ادارہ الفضل کی 46ویں کاوش ہے۔ جسے مکرم محمد انور شہزاد نے کتابی شکل دی ہے۔ فَجَزَاکُمُ اللّٰہُ تَعَالیٰ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

حنیف محمود

ایڈیٹر روزنامہ الفضل آن لائن

19-03-23

انڈیکس

* * * * *

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا وصفِ شعر و سخن

(قسط اول)

ہر صاحبِ ذوق تجزیہ نگار کسی شاعر کی شعر و سخن میں بلندی اور کمال کے تجزیہ کے لئے اپنے ذوق کے مطابق معیار مقرر کر لیتا ہے۔ لیکن اگر اس کے لئے حسبِ ذیل چار امور مد نظر رکھے جائیں تو امید ہے کہ یہ ایک حقیقی جائزہ ہو گا مثلاً۔

اول: یہ کہ اس کے شعری تخیل، استغراق اور تخلیق کا سرچشمہ کیا ہے۔

دوم: یہ کہ اس کا کلام کن خصائل اور خواص و خوبیوں سے مزین ہے۔

سوم: یہ کہ وہ شعر و سخن میں صاحبِ کمال شعراء اور اساتذہ فن کے کلام کا فہم و ادراک کس حد تک رکھتا ہے اور

چہارم: یہ کہ وہ داد داوری میں کس درجہ خالص و صادق، تنقید میں کس قدر بلند و رفیع اور اصلاح و تجویز میں کتنا بلیغ و وسیع ہے۔

شاعری کے تجزیہ میں عموماً شعر کے تکنیکی فن مثلاً علمِ عروض وغیرہ کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ شعر کی صنعت اور اس میں الفاظ و جمل کی تنصیب میں علمِ شعر کی جملہ شاخیں انتہائی اہم کردار کی حامل ہیں۔ مگر اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ دستِ قدرت کے تراشے ہوئے شاعر کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بذاتِ خود قدرت کی صناعی کا ایک شاہکار ہوتا

ہے۔ اس لئے اس کا کلام شاعری کے مروجہ ماخذ اور علم نقد و نظر کی تیش زنی سے بالا بھی ہوتا ہے اور اعلیٰ بھی۔ جس طرح ایک خوش گلو کچھ بھی گنگنائے، اس کی آواز میں خاص کھنک اور نغمگی مترنم ہوتی ہے، اسی طرح دستِ قدرت کے تخلیق کردہ شاہکار شاعر کا عام کلام بھی شعریت کی بُو باس سے لبریز اور عروض کے اَوزان میں تُلا ہوا ہوتا ہے۔ سو حقیقی شاعر اپنا کلام مشقِ سخن کے ذریعہ قطع و ضع نہیں کرتا، استغراقِ ذات سے تخلیق کرتا ہے یا دستِ قدرت خود اسے تراشتا ہے۔ پس جس درجہ کا استغراقِ ذات ہوتا ہے یا جس مرتبہ کی صنعتِ قدرت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اسی مقام کا شعر ظہور کرتا ہے۔

شعر و سخن کی آگہی کے ان دریچوں سے بھی اگر حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کے شعری کلام کو دیکھا جائے تو آپؒ بحیثیتِ شاعر اسی زمرہ میں سرو قامت دکھائی دیتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ اپنے معجزانہ تصرف سے اور خاص اغراض کے لئے شعر و سخن عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا آپؒ کا کلام نہ صرف شاعری کے مروجہ معیاروں پر کماحقہ، پورا اترتا بلکہ ان کی پرکھ سے بالاتر ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ کیونکہ در حقیقت اہلُ اللہ کی شاعری کا اول مقصد ترسیلِ پیام اور ابلاغ عام ہے۔ غالباً اسی کے پیشِ نظر کسی نے خوب کہا ہے کہ "شاعری جزویست از پیغمبری"۔ کہ شاعری پیغمبری ہی کا ایک جزو ہے۔ لہٰذا شعر و سخن ایسے باکمال لوگوں سے اپنی سند لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ باکمال لوگ شاعری کی روایات و اسالیب کے پابند نہیں ہوتے بلکہ فن شعر و سخن ان سے سند حاصل کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر تخیلاتِ روح کے سوتوں سے پھوٹتا ہے، فکر و ادراک کی گود میں پروان چڑھتا ہے اور مشقت و مزاولت کی منزلیں طے کرتا ہوا روح، احساس اور شعور کے سرچشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ لہٰذا چشمے کا بڑا یا چھوٹا ہونا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ اس کا منبع کیا ہے اور اس سے پھوٹتا کیا ہے، اس میں زور ہے تو کتنا، اس کی تاثیر ہے تو کیا، اس میں لذت ہے تو کیسی اور درد ہے تو کونسا؟ نیز یہ کہ پڑھنے اور سننے والا بقدرِ ہمت و قدرت سیراب بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ

آپؒ کے کلام کا سر چشمہ

دیگر بیشمار صفات کی طرح شاعری بھی انسان کے ان اوصاف میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ اسے ودیعت کرتا ہے۔ اور در حقیقت یہی اصل شاعری ہے یا شاعری کی اصل ہے۔ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی مبارک اولاد میں سے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا مبارک احمد صاحب اور حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے بچپن میں ہی شعری وصف سے نوازا تھا۔ اس مبارک خاندان کے اور افراد بھی اس وصف سے مزین ہوئے۔ اسی تسلسل میں حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمدؒ کو بھی قادر و علیم صناعِ قدرت نے یہ وصف خود اپنی جناب سے عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ آپؒ نے بھی بازیچہ اطفال میں ہی شعر بُننے شروع کر دئے تھے۔ الفاظ کا جڑاؤ اور شعر و مصرعے کی تراش خراش اور ان کا وزن آپ کے اندر قدرتی طور پر ودیعت تھا۔ چنانچہ حسبِ ذیل شعر غالباً آپؒ کا پہلا شعر ہے۔ جو آپؒ 1934ء میں پانچ برس کی عمر میں گنگناتے پھرتے تھے کہ

نام میرا طاہر احمد، طاری طاری کہتے ہیں
مسیح موعود کے گھر میں بڑی خوشی سے رہتے ہیں



اللہ بہتر جانتا ہے کہ آپؒ کو اس کا شعور تھا بھی یا نہیں کہ یہ شعر ہے یا ایامِ طفولیت کی وہ لہر جس میں بچے بسا اوقات ان چند الفاظ کو جو زبان پر مچل جائیں، گنگنانے لگتے ہیں۔ چنانچہ پانچ سالہ صاحبزادہ صاحب جب گنگنانے لگے تو وہ الفاظ منتشر اور غیر منظم نہیں تھے بلکہ ایک شعر میں مرصع و منضبط تھے۔ یعنی یہ ایک مکمل شعر تھا۔

اس شعر کا پہلا مصرعہ علمِ شعر و عروض کے لحاظ سے اپنی صنعت میں مکمل طور پر درست ہے۔ گو دوسرے مصرعے میں اس کا وزن معمولی سا الجھا ہے۔ مگر اپنی شعریت میں مکمل ہے۔ ہاں اسے اگر ماحول کے مروجہ پنجابی لہجے میں پڑھا جائے تو یہ اپنے وزن میں بھی قائم ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ عام قانونِ قدرت کے تحت اس عمر کے بچے کے تخیلات اس کے آشیانے کی دیواروں کو نہیں پھاند سکتے۔ اس کی یہی کل کائنات ہوتی ہے جس میں وہ اپنی زندگی کی تمام لذتوں، راحتوں اور خوش بختیوں کو محسوس کرتا اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہی راحتیں اور خوش بختیاں اس کی گنگناہٹوں کو راگ عطا کرتی ہیں۔ شعری صنعت سے بے نیاز بچپن کی موج ترنگ میں ڈھلی ہوئی اس گنگناہٹ میں بھی آپؒ کی اس فطرتی سعادت کی آواز سنائی دیتی ہے جو حضرت مسیحِ موعود کے ''الدار'' سے وابستہ ہے۔ اس زمانے میں تصنع اور تکلف سے مبراجن جذباتِ امتنان و اطمینان کا اظہار اس شعر سے پھوٹتا ہے، حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام سے آپؒ کی قلبی وابستگی کا غماز ہے۔ اس کے بعد جب آپؒ کچھ شعور کی عمر کو پہنچے تو باقاعدہ شعر کی تخلیق ہو گئی۔ 1944ء میں آپؒ کی والدہ ماجدہؓ کا انتقال ہوا تو آپؒ نے ان کو سفرِ آخرت کے لئے الوداع کرتے ہوئے کہا:

گو جدائی ہے کٹھن دور بہت ہے منزل
پر مرا آقا بلا لے گا مجھے بھی اے ماں!
اور پھر تم سے مَیں مل جاؤں گا جلدی یا بدیر
اُس جگہ، مل کے جدا پھر نہیں ہوتے ہیں جہاں

اُس وقت جب آپؒ نے یہ اشعار قلمبند کئے، آپؒ کی عمر سولہ برس تھی۔ یہ گویا آپؒ کی شاعری کی شروعات تھیں۔ دردِ نہاں کے سوتوں سے پھوٹتی ہوئی آپؒ کی ابتدائی شاعری میں سے ایک نظم جس کا پہلا شعر آپ کی والدہ مرحومہؓ کی اک تصویر کا مرہونِ منت ہے۔ دل کا جو درد اس شعر میں جھلک رہا ہے، وہ ہر قاری کے دل میں بھی درد کی ایک کسک جگا دیتا ہے۔ آپؒ کہتے ہیں:

تیرے لئے ہے آنکھ کوئی اشک بار دیکھ
نظریں اٹھا خدا کے لئے ایک بار دیکھ

پھر آپؒ ضبطِ الم کی کیفیتِ بے ضبط کو کس بے اختیاری سے بیان کرتے ہوئے بندِ صبر و شکیب کو آنسوؤں سے سجاتے ہوئے کہتے ہیں:

تُو مجھ سے آج وعدہ ضبطِ الم نہ لے
ان آنسوؤں کا کوئی نہیں اعتبار دیکھ
بندِ شکیب توڑ کر آنسو برس پڑے
اپنوں پہ بھی نہیں ہے مجھے اعتبار دیکھ

یعنی اس دنیا میں اگر کسی پر اعتبار ممکن ہے تو خدا تعالیٰ پر ہے جو ہمیشہ سہارا اور ساتھ دینے والا رفیقِ اعلیٰ ہے۔ اپنوں پر کوئی کیا انحصار کر سکتا ہے۔ اس آخری شعر میں لفظ ''اپنوں'' ذو معنی بھی ہے اور سچائیوں سے سینچا ہوا بھی۔ اس شعر میں سموئے ہوئے تخیل کی گہرائی میں ایک منزل بھی اتریں تو اس کی پنہائیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ دنیا میں ماں سے زیادہ اپنا کوئی نہیں ہو گا۔ اگر وہی چھوڑ جائے تو انسان پھر کس پر اعتبار کرے۔ پس دنیا میں انسان کو کبھی اپنے چھوڑ جاتے ہیں اور کبھی وہ اپنوں کو چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں ''اپنوں'' کا لفظ ایک گہرا اور لطیف پہلو بھی لئے ہوئے ہے جو اپنی ''ذات'' کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ خود مجھے اپنے آپ پر بھی اختیار نہیں کہ آنسوؤں کو اپنے قابو میں رکھ سکوں۔ پس اصل حقیقت، پناہ، ساتھی اور سہارا خدا تعالیٰ ہے جو ساتھ بھی رہتا ہے اور باقی بھی۔ حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام اسی سچائی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

خویش، قوم و قبیلہ پُر ز دغا
تُو بریدہ برائے شاں ز خدا

کہ اپنے ہوں یا قوم و قبیلے والے، سب ایک طرح کے دھوکے سے بھرے ہوئے ہیں۔ کیا تُو ان کی خاطر خدا تعالیٰ سے تعلق قطع کرتا ہے؟ یعنی وہ جو چھوڑ جانے والے ہیں، ان پر اعتبار کی بجائے

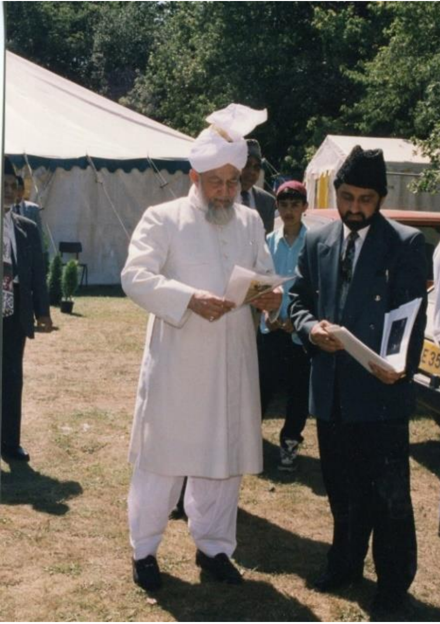
خدا تعالیٰ پر اعتبار اور انحصار کرنا ہی اصل حقیقت ہے۔ آپؒ نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں اپنی ان ابتدائی نظموں اور اشعار پر نظرِ ثانی فرمائی جو ”کلامِ طاہر“ میں ”ابتدائی کلام کے چند نمونے“ والے حصے میں شائع شدہ ہیں۔ ان میں سے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں:

منتظر میں ترے آنے کا رہا ہوں برسوں
یہ لگن تھی تجھے دیکھوں تجھے چاہوں برسوں
اے مجھے ہجر میں دیوانہ بنانے والے
غمِ فرقت میں شب و روز ستانے والے
اے کہ تو تحفہ درد و غم و ہم لایا ہے
دیر کے بعد بڑی دُور سے آنے والے
جا کہ اب قرب سے تیرے مجھے دکھ ہوتا ہے
اے شب غم کے سویرے مجھے دکھ ہوتا ہے

1944ء کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو۔

یہ دو آنکھیں ہیں شعلہ زا۔ یا جلتے ہیں پروانے دو
یہ اشکِ ندامت پھوٹ پڑے۔ یا ٹوٹ گئے پیمانے دو
پہلے تو مری موجودگی میں تم اکتائے سے رہتے تھے
اب میرے بعد تمہارا دل گھبراتا ہے گھبرانے

دو شعری تخلیق کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا اور جاری رہا۔ تقسیمِ ہند کے بعد بھی آپؒ نے کچھ نظمیں کہیں جن میں ”خدام احمدیت“ نغمہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ اسی طرح لندن میں تعلیم کے لئے قیام کے دوران بھی آپؒ اپنے رہائشی کمرے کی تنہائیوں میں حسبِ آمد و آوُرد فکرِ سخن کرتے تھے۔ لیکن آپؒ کے صرف چند ایک ہم عصر ہی اس سے واقف تھے۔ ان دنوں ٹیپ ریکارڈر کی ایجاد نئی نئی تھی۔



مکرم چوہدری انور احمد کاہلوں صاحب نے پاکستان جاتے وقت آپؒ سے خواہش ظاہر کی کہ اپنی کچھ نظمیں اور غزلیں ریکارڈ کروادیں تاکہ ربوہ جا کر وہ آپؒ کے والد ماجد حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

مکرم چوہدری انور احمد کاہلوں صاحب نے آپؒ کا کچھ کلام ریکارڈ کیا اور پاکستان جانے سے قبل ایک دن اتفاقاً حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خانؓ کو آپؒ کا ریکارڈ کردہ منظوم کلام سنایا۔ بڑی توجہ اور غور سے سماعت کے بعد حضرت چوہدری صاحبؓ فرمانے لگے:

”ان اشعار میں تو ان زخموں کے نشان صاف دکھائی دے رہے ہیں جو اُن کے قلب و ذہن پر ان کی والدہ کی وفات کی وجہ سے مرتسم ہوئے ہیں۔“

سالوں بعد جب حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خانؓ کے اس تبصرے کا صاحبزادہ صاحبؒ کو علم ہوا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

”یہ صحیح ہے کہ میرے ابتدائی اشعار غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے شعر کیا تھے میرے قلبی حزن و ملال کا اظہار تھا۔ میں سطحی موضوعات پر شعر کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ شعر میں جذبے کا ہونا ضروری ہے۔ ... ہو سکتا ہے کہ شعر کے اس تخلیقی عمل کا تعلق اس صدمے سے ہو جس کی طرف چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب نے اشارہ کیا تھا۔ لیکن حقیقت تمام تر یہ نہیں تھی۔ میں اپنے گردو پیش اوروں کے غم دیکھ کر بھی اکثر غمگین ہو جایا کرتا تھا اور دل ہی دل میں غم

کی یہ صلیب اٹھائے پھرتا تھا اور پھر غم کا یہ احساس شعر کے قالب میں ڈھل جاتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ جب میرے والد ماجد نے میرے اشعار کے ریکارڈ سُنے تو فرمایا:

''میری خواہش تو یہ ہے کہ نوجوان اپنی نظریں بلند رکھیں''۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ نوجوان چاروں طرف پھیلے ہوئے غم اور اندوہ کے اس طوفان کے سامنے ڈٹ جائیں اور اپنی منظومات میں اسی عزم کا اظہار کریں اور اسی کو موضوع سخن بنائیں۔ ہمارے والد ماجد ہماری تعریف کرتے وقت بڑے حزم و احتیاط سے کام لینے کے عادی تھے۔ اپنی خوشنودی کا اظہار بڑے محتاط لفظوں میں کرتے۔ کبھی کبھی تعریف بھی کرتے لیکن اکثر خاموش رہتے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہماری شخصیت بلا روک ٹوک کسی قسم کی دخل اندازی اور سہارے کے بغیر پروان چڑھے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہمارے اندر یہ شعور بیدار ہو کہ ہم بھی عام انسانوں کی طرح کے انسان ہیں اور امامِ وقت کا فرزند ہونے کی وجہ سے ہمیں کوئی خصوصیت یا برتری حاصل نہیں''

حضرت مصلحِ موعود رضی اللہ عنہ کے نوجوانوں کے لئے مذکورہ بالا اظہارات اور توقعات کی جھلک بھی آپؒ کے کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ آپؒ نے نہ صرف اپنی نظروں کو بلند و بلیغ رکھا اور رفعتوں کا سفر اختیار کیا بلکہ اپنے ساتھیوں اور اپنی جماعت کو بھی ان رفعتوں سے ہمکنار ہونے کا درس، حوصلہ اور زادِ راہ دیا۔

آپؒ کے کلام کے محاسن

حضرت صاحبزادہ صاحبؒ کا کلام شعر و سخن کی تمام درخشندہ خوبیوں سے مزین اور اس کی صنعت و ترکیب کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ حمد و ثنا میں آپؒ کا کلام بے نظیر ہے تو طرب و مزاح میں بے مثال۔ نعت بھی اپنے مضمون میں کمال عروج پر ہے تو رنگِ تغزل بھی دلفریب جوبن کی دلکشی پیش کرتا ہے۔ الغرض جس پہلو سے دیکھیں یا جس نوع سے بھی پرکھیں آپؒ شاعری کے روایتی معیاروں کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ یعنی اصنافِ شاعری کے کسی پیمانے پر بھی پرکھا جائے اور دیگر شعراء سے موازنہ کیا جائے تو لاجرَم آپؒ ان میں شمشاد قامت ہیں۔

صنفِ نعت



آپؒ کے نعتیہ کلام میں نعت ''اے شاہِ مکی و مدنی سید الوریٰؐ'' میں رؤیا میں سنائی دینے والے کلمات ''اے میرے والے مصطفیٰؐ'' میں جہاں وارفتگی میں ٹوٹ کر ایک استغراقی اپنائیت کا اظہار ہوا ہے وہاں اس میں اپنے محبوب آقا و مولیٰ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰؐ پر اپنے اس خاص حقِ ایمان کا بھی اظہار ہے جس میں ایک احمدی دوسروں سے لاکھوں گنا ممتاز ہے۔ یہ حق وہ ہے جس کے بارے میں حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام نے فرماتے ہیں:

''مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہؐ کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ یہ ہم پر افترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت، یقین، معرفت اور بصیرت سے آنحضرتؐ کو خاتم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں، اس کا لاکھواں حصہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے اور ان کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاء کی ختمِ نبوت میں ہے، سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف باپ دادا سے ایک لفظ سنا ہوا ہے مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ختمِ نبوت کیا ہوتا ہے، اس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟ مگر ہم بصیرت تام سے (جس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرتؐ کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ہم پر ختمِ

نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس کے عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا بجز ان لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیر اب ہوں۔“

(ملفوظات جلد اول صفحہ 243)

اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیؐ پر اپنے اس حقِ ایمان کا اظہار اس نعت میں نمایاں ہے جو حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کے اس مذکورہ بالا بیان میں علیٰ وجہ البصیرت اور عملی سچائیوں کے ہمراہ موجود ہے۔

جہاں تک مصرعے ”اے میرے والے مصطفیؐ....“ کا تعلق ہے، آپؒ اس کی عمیق گہرائیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اس نظم کا شانِ نزول تو ایک رؤیا میں ہے جس میں ایک شخص کو دیکھا جو بڑی پُر درد آواز میں حضرت اقدس محمد مصطفیٰ رسول اللہؐ کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت مسیح موعودؑ کا کوئی کلام پڑھ رہا ہے۔ ان شعروں کا عمومی مضمون تو مجھے یاد رہا مگر الفاظ یاد نہیں رہے۔ البتہ ایک مصرعہ جو غیر معمولی طور پر میرے دل پر اثر کرنے والا تھا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا:

”اے میرے والے مصطفیؐ“

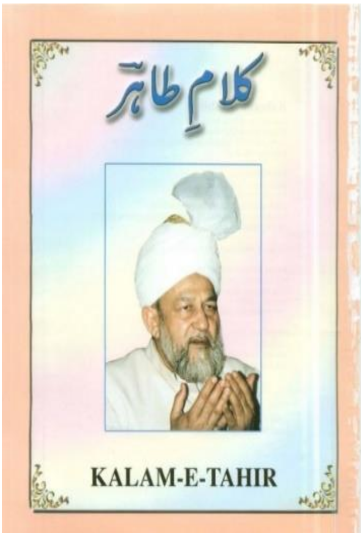
خواب میں اس کا جو مفہوم سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ لفظ ’والے‘ نے بجائے اس کے کہ سقم پیدا کیا ہو اس میں غیر معمولی اپنائیت بھر دی اور قرآن کریم کی بعض آیات کی بھی تشریح کر دی جن کی طرف پہلے میری توجہ نہیں تھی۔ عموماً یہ تأثر ہے کہ صرف رسول اللہؐ ہی مصطفیٰ ہیں حالانکہ قرآن کریم میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، اور آل ابراہیم (اسحٰقؑ، یعقوبؑ، اسمٰعیلؑ) حضرت موسیٰؑ اور حضرت مریمؑ حتیٰ کہ بنی آدم کے لئے بھی لفظ اصطفیٰ استعمال ہوا ہے۔ تو مصطفیٰ ایک نہیں، کئی ہیں۔ پس اگر یہ کہنا ہو کہ باقی بھی مصطفیٰ ہوں گے مگر میرے والا مصطفیٰ یہ ہے تو اس کا اظہار ان الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ میں ممکن نہیں۔ یہ بات ایسی ہی ہو گی جیسے کوئی

بچہ ضد کرے کہ مجھے میرے والی چیز دو۔ میرے والی کہنے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مجھے محض یہ چیز نہیں چاہئے بلکہ وہی چیز چاہئے جو میری تھی۔ اس طرزِ بیان میں اظہارِ عشق بھی محض ”میرے مصطفیٰ“ کہنے کے مقابل پر بہت زیادہ زور مارتا ہے۔ پس رؤیا میں ہی میں یہ نہیں سمجھ رہا کہ اس میں کوئی نقص ہے بلکہ اس ظاہری نقص میں مجھے فصاحت وبلاغت کی جولانی دکھائی دی اور مضمون میں مقابلتاً بہت زیادہ گہرائی نظر آنے لگی۔“

(الفضل4؍ستمبر 2003ء)

صنفِ نعت میں جو کلام حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی جماعت کو عطا کیا ہے وہ اپنے حسن وخوبی، عشقِ رسولؐ کے اظہار اور آپؐ کے مقام ومرتبہ کے بیان اور دیگر خصوصیات میں بے بدل ہے۔ ایسا اعجازی کلام کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہے اور فارسی میں ایک شعر تو ایسا ہے کہ ہزاروں اشعار پر بھی وزنی اور فائق ہے۔ آپؑ فرماتے ہیں:

اگر خواہی دلیلے عاشقش باش
محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ



کہ اگر محمدؐ کی صداقت وعظمت کی دلیل چاہتا ہے تو بس (آپؐ کا) عاشق ہو جا۔ پھر دیکھ کہ محمدؐ خود اپنی دلیل آپؐ ہیں۔ حضرت مرزا طاہر احمد صاحبؒ کی ذات میں اس شعر کا عکس نمایاں نظر آتا تھا۔ محمدؐ نام زبان پر آتے ہی آپؒ کا دل ہر بار آبِ چشم بن کر ٹپک پڑتا تھا اور وارفتگی میں آپؒ کی رندھی ہوئی آواز کے ہمراہ آپؒ کا سراپا اس بات کی شہادت دیتا تھا کہ

محمدؐ ہست برہانِ محمدؐ

وہ ایک عظیم الشان شخص جو عشقِ محمدؐ میں ایسا سرخوش ہوا، ایسا جذب اور ایسا فنا ہوا کہ سچ مُچ اس کا مثیل و مہدی بن گیا۔ وہ پھر اس مقام پر پہنچا کہ جس کا مقتضائے حال یہ تھا کہ "مَنْ فَرَقَ بَیْنِی وَ بَیْنَ الْمُصْطَفٰی فَمَا عَرَفَنِی وَمَا رَاٰی" کہ جس نے مجھ میں اور میرے مصطفیؐ میں فرق کیا اس نے نہ مجھے پہچانا نہ (میری محبت کی حقیقتِ عظمت کو) مشاہدہ کیا۔ حضرت صاحبزادہ صاحبؒ اپنی نعت "ظہورِ خاتم الانبیاء" میں اس حقیقت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ۔

وہ ماہِ تمام اس کا، مہدی تھا غلام اس کا
روتے ہوئے کرتا تھا وہ ذکر مدام اس کا
مرزائے غلام احمد، تھی جو بھی متاعِ جاں
کر بیٹھا نثار اس پر، ہو بیٹھا تما م اس کا
دل اس کی محبت میں ہر لحظہ تھا رام اس کا
اخلاص میں کامل تھا وہ عاشقِ تام اس کا
اِس دَور کا یہ ساقی، گھر سے تو نہ کچھ لایا
مَے خانہ اسی کا تھا، مَے اس کی تھی، جام اس کا
سازِندہ تھا یہ، اِس کے۔ سب ساجھی تھے مِیت اس کے
دُھن اِس کی تھی، گیت اُس کے۔لب اِس کے، پیام اُس کا

اور پھر اس کی وساطت سے ایک درد بھری یہ التجا بھی کرتے ہیں کہ۔

اِک میں بھی تو ہوں یارب، صیدِ تہِ دام اس کا
دِل گاتا ہے گُن اُس کے،لب جپتے ہیں نام اُس کا
آنکھوں کو بھی دکھلا دے، آنا لبِ بام اس کا
کانوں میں بھی رس گھولے، ہر گام خرام اُس کا

خیرات ہو مجھ کو بھی اک جلوہ عام اس کا
پھر یوں ہو کہ ہو دل پر الہام کلام اس کا

اس ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ صنفِ نعت میں مبنی بر رؤیا آپؒ کی ایک نعت کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، اب ایک اور نعت کا ذکر سنئے جو غزل کے نام پر از راہِ رؤیا اتری۔ یہ نعت نما غزل یا غزل نما نعت بھی یقیناً شعر و سخن میں ایک منفرد نوع کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپؒ فرماتے ہیں:

”میں نے رؤیا میں دیکھا کہ کوئی عزیز ہے وہ میرے لئے ایک مصرعہ پڑھتا ہے اور وہ مصرعہ خواب میں بالکل موزوں ہے یعنی باقاعدہ باوزن مصرعہ ہے لیکن اٹھنے کے بعد پورا یاد نہیں رہا۔ لیکن آخری حصہ اس کا یاد رہا جس کے مطابق پھر یہ غزل کہی گئی۔ مضمون اس کا یہ تھا کہ لوگ آج کل کے زمانہ میں، ابتلا کے زمانہ میں، ایسے ایسے شعر لکھ کر بھجواتے رہتے ہیں، نظمیں کہتے رہتے ہیں تو اجازت ہو تو میں بھی کہوں ایک غزل آپ کے لئے۔

”غزل آپ کے لئے“ کے لفظ بعینہٖ وہی ہیں جو رؤیا میں دیکھے گئے تھے.......... چنانچہ اس ”آپ کے لئے“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو میں نے غزل کہی اس کے پہلے چند اشعار اور آخری در اصل نعتیہ ہیں۔ وہ میں نے حضرت محمدﷺ کو مخاطب کر کے کہے ہیں اور بیچ میں چند اشعار دوسرے مضامین کے لئے ہیں لیکن میں یہ سمجھا دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے متعلق نہیں کہہ رہا۔ میں نے خود اپنے متعلق تو وہ غزل نہیں کہی تھی۔

اگرچہ کسی اور کے خیال سے بعض دفعہ انسان اپنے متعلق بھی اک آدھ شعر کہہ لیتا ہے کسی انسان کی زبان میں کہ گویا تم یہ چاہتے ہو کہ مجھے یہ پیغام دو۔ ایسے بھی ایک دو شعر اس میں ہیں لیکن در اصل اس کے اکثر شعر نعتیہ ہیں۔

پہلے چند اور آخری خصوصیت کے ساتھ۔ تو اس کا پس منظر ہے جو امید ہے معلوم ہونے کے بعد اس غزل کی طرز بھی سمجھ آجائے گی کہ کیا طرز ہے۔“

(روزنامہ الفضل ربوہ 15 فروری 1990ء)

چست بندشیں

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمدؒ کے کلام کی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ اس میں بندشیں بھی چست ہیں اور محاورے بھی۔ جس کی وجہ سے مضمون اور پیغام میں کمزوری یا زبوں کی جھلک تک نہیں ہے۔ آپؒ کے ابتدائی کلام میں سے ''عشقِ نارسا'' کے عنوان سے کہی گئی پچیس اشعار کی نظم کو دیکھیں۔ اس کی ردیف میں لفظ 'سا' اور اس کی سادگی نے ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ہر شعر کو صرف اس دوحرفی لفظ نے آسمان پر بٹھا دیا ہے۔ چنانچہ آپؒ لکھتے ہیں:

کبھی اپنا بھی اک شناسا تھا کوئی میرا بھی آسرا سا تھا
کبھی میں بھی کسی کا تھا مطلوب یا مجھے بس یونہی لگا سا تھا
یوں لگا جب ملا وہ پہلی بار جیسے صدیوں سے آشنا سا تھا
بھر دیا اس نے جو برسوں سے میرے سینہ میں اک خلا سا تھا

ہمہ جہتی

اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آپؒ چونکہ ایک ہمہ جہات، ہمہ صفات اور ہمہ اغراض الٰہی قائد تھے اور شاعری آپؒ کا مطمحِ نظر نہ تھی۔ اس لئے آپؒ نے زیادہ نہیں لکھا۔ لیکن آپؒ کے کلام میں طرب و مزاح کے ساتھ میرؔ و غالبؔ کے ہنر کی تابانی، معرفتِ یزدانی کی نور افشانی، تصوف کے حال و مقام، جلوہ ہائے حسنِ فطرت بکمالِ تام، مسیحِ زماں کی مسیحائی، عشقِ رسولؐ کی دلربائی، نبیوںؑ سا انذار، رومی و سعدی مثال افکار، تقدیرِ خداوندی سے جُڑی ہوئی پیشگوئیاں اور خوشخبریاں نیز کروڑوں دلوں کی دھڑکنیں بھی موجود ہیں۔ وہ دَورِ گزشتہ کے فکر و ادب سے بھی مرصع ہے اور عصری فکر و نظر کے اعلیٰ سانچے اور زاوئے بھی دکھاتا ہے۔ یعنی اس میں دَورِ ماضی کی جوت بھی ہے اور نئے دَور کی دمک بھی۔

سلاست و روانی

سلاست و روانی آپؒ کے کلام کی ہمراز ہے، جو کسی بھاری بھر کم لفظ کو بھی بڑی آسانی اور ملائمت کے ساتھ اپنے اندر ایسے سمو لیتی ہے جیسے ایک خرام ناز ندی کسی سنگِ راسخ سے چھُو کر ایک گداز ساز چھیڑتی ہوئی گزر جائے۔ پھر آپؒ کے کلام میں لفظوں پر بند بھی کمال کا ہے۔ مثلاً ایم ٹی اے کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

جو اُس کے ساتھ، اسی کی دعا سے اترا ہے
یہ مائدہ ہے ڈشوں میں اتار کر دیکھو

یہ شعر بتاتا ہے کہ قرآن کریم میں مذکور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی دعا والے آسمانی مائدہ کو اب مسیحِ زمان کے ذریعہ آسمان سے اترنے والے آسمانی فیوض وبرکات سے مماثلت و مشابہت ہے۔ اس دَور کا یہ آسمانی مائدہ ہے، جسے طعام وطباق (ڈش) کی تشبیہہ میں چن کر آپؒ نے سیٹلائٹ ڈشوں میں پیش فرمایا ہے۔

الغرض آپؒ کے میکدہ سخن کے تمام جام وسبو پُر کیف و پُر سرور اور نشہ خیز ہیں جو قاری کو بقدرِ ہمت عرفان و مطالب سے مخمور اور غور کرنے والے کو مسحور کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ آپؒ کے اشعار دِل میں اترتے ہی، اثر کرتے ہیں اور انقلاب خیز ہیں۔

شدت و توازنِ جذبات

کہتے ہیں کہ شاعری تو جذبات اور احساسات کا اظہار ہے۔ چنانچہ آپؒ کی شاعری میں شدتِ جذبات و وسعتِ احساسات، لغت کا احاطہ اور پیرایہ اظہار منفرد تھا۔ دَورِ ہجرت میں اہلیہ حضرت سیدہ آصفہ بیگم نور اللہ مرقدھا کی وفات کا صدمہ بہت بھاری تھا۔ مگر اس ضبطِ غم کا اظہار بھی ایک اعجاز تھا۔ اور آپؒ اسی ضبطِ غم کو اللہ تعالیٰ کا ایک فیض پُر از اعجاز بتاتے ہیں۔ آپؒ نے لکھا:

اسی کا فیض تھا ورنہ میری دعا کیا تھی
کہے سے اس کے دکھاتا تھا میرا غم اعجاز
جب اُس کا اذن نہ آیا خطا گئی فریاد
رہی نہ آہ کرشمہ نہ چشمِ نم اعجاز
غِنا نے اس کی جو عرفانِ بندگی بخشا
نہیں تھا وہ کسی جود و عطا سے کم اعجاز
اسی کو ہو گئیں تم اسی کے اَمر ہی سے تمہیں
اَمر بنانے کا دکھلا گئی عدم اعجاز
کبھی تو آکے ملیں گے چلو خدا حافظ
کبھی تو دیکھیں گے احیاءِ نو کا ہم اعجاز

یہاں چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ جبکہ پوری نظم اس ردیف قافیہ کے ساتھ ایک اعجاز سے کم نہیں۔ زندگی کی ایک رفاقت ختم ہو رہی ہے لیکن رفیقِ اعلیٰ کی رفاقت کا ذکر بھی دوش بدوش چل رہا ہے۔ یہی نہیں۔ صدمے کی اس شدت میں بھی احساس کی وسعت اپنے دامن میں جن خیالات کو سمیٹتی ہے اور جن غریبوں کی محرومیوں کا احاطہ کر کے صدمے کی شدت کو اور انگیخت کر دیتی ہے، وہ آپؒ کے ایک خط کے اقتباس سے شاید کسی حد تک ظاہر ہو سکے۔ فرمایا:

”ہجر و فراق کے موضوع پر اچھے شعراء کا پُر تاثیر کلام پڑھ کر بعض دفعہ میں سوچتا ہوں کہ شاعر تو انجمنِ خیال سجا کر اپنی خلوتوں میں کچھ نہ کچھ جلوتوں کے رنگ بھر ہی لیتے ہیں۔ سادہ لوح صلاحیتِ سخن سے عاری لوگ کیا کرتے ہوں گے۔ ان مجبوروں کی تنہائیوں کے خلا کے تصور سے بھی وحشت ہوتی ہے۔ اس ویرانی میں تو لالہ صحرا کا سایہ بھی افعی نظر آتا ہو گا۔“

ہجر و فراق کی ایک الگ داستاں

جدائی کا ذکر چلا ہے تو آپؒ کی ہجرت کے نتیجہ میں ہجر و فراق کی جو تاریخ شروع ہوئی، اس میں پاکستان میں پھیلے ہوئے آپؒ کے پیاروں پر ظلم و تشدد کی داستانِ دلفگار بھی داخل ہے۔ اس فضائے درد میں لگتا ہے کہ آپؒ کا کلام ان مہجوروں کے لئے وقف ہو گیا جو آپؒ کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ ان اسیر انِ راہ مولا کے لئے جن کا جرم کوئی نہیں تھا مگر پسِ دیوارِ زنداں پابندِ سلاسل تھے۔ ان میں وہ بے قصور بھی تھے جو محض خدا تعالیٰ کی خاطر اپنے دین سے وابستگی کے ''جرم'' میں پھانسی کی سزائیں سن چکے تھے اور کال کوٹھڑیوں میں موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے غم کو دل سے زبان تک لاتے ہوئے آپؒ اپنے خدا سے فریاد بھی کرتے ہیں اور بڑے پیار سے حقِ وفا میں لپٹا ہوا گلہ بھی کرتے ہیں کہ:

ہیں کتنے ہی پابند سلاسل وہ گنہگار
نکلے تھے جو سینوں پہ ترا نام سجا کے
میں ان سے جدا ہوں مجھے کیوں آئے کہیں چین
دل منتظر اس دن کا کہ ناچے انہیں پا کے
عشاق تیرے جن کا قدم تھا قدَمِ صدق
جاں دے دی نبھاتے ہوئے پیمانِ وفا کے
آداب محبت کے غلاموں کو سکھا کے
کیا چھوڑ دیا کرتے ہیں دیوانہ بنا کے

ایک طرف اگر اللہ تعالیٰ سے التجاؤں کے دوش بدوش محبتوں کے مان پر شکوے بھی ہو رہے تھے تو دوسری طرف پیار اور شفقتوں بھرے پیغاموں اور دل سے دلاسوں کی ترسیل جاری تھی۔

اپنی سانسوں میں بسنے والوں سے بڑی دل سوزی سے خطاب ہو رہا تھا۔

دیارِ مغرب سے جانے والو! دیارِ مشرق کے باسیوں کو
کسی غریب الوطن مسافر کی چاہتوں کا سلام کہنا
ہمارے شام و سحر کا کیا حال پوچھتے ہو کہ لمحہ لمحہ
نصیب ان کا بنا رہے ہیں تمہارے ہی صبح و شام کہنا
تمہاری خاطر ہیں میرے نغمے، میری دعائیں تمہاری دولت
تمہارے درد و الم سے تر ہیں مرے سجود و قیام کہنا

اور اس کے ساتھ ساتھ یقین اور عزم کے ساتھ آنے والے اچھے دنوں اور ایک جہانِ نو کی بشارتیں بھی دی جارہی تھیں کہ:

تمہیں مٹانے کا زُعم لے کر اٹھے ہیں جو خاک کے بگولے
خدا اڑا دے گا خاک ان کی کرے گا رسوائے عام کہنا
بساطِ دنیا الٹ رہی ہے حسین اور پائیدار نقشے
جہانِ نو کے ابھر رہے ہیں بدل رہا ہے نظام کہنا
کلید فتح وظفر تھمائی تمہیں خدا نے اب آسماں پر
نشانِ فتح و ظفر ہے لکھا گیا تمہارے ہی نام کہنا

پھر جلسہ سالانہ کے وہ دن بھی آتے ہیں جو کبھی ربوہ کے گلی کوچوں کو شاداں کر دیتے تھے۔ مگر اب وہ ایک بدیس آشیاں کو غم سے بھر دیتے ہیں۔ فضاؤں میں اُڑتے ہوئے قافلے دور دیسوں سے آکر اُس کے آنگن میں اترتے ہیں مگر کچھ ایسے پر شکستہ بھی ہیں جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کے لئے اس کا شاعر دل اداس ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

آئے وہ دن کہ ہم جن کی چاہت میں
گنتے تھے دن اپنی تسکینِ جاں کے لئے
پھر وہ چہرے ہویدا ہوئے جن کی

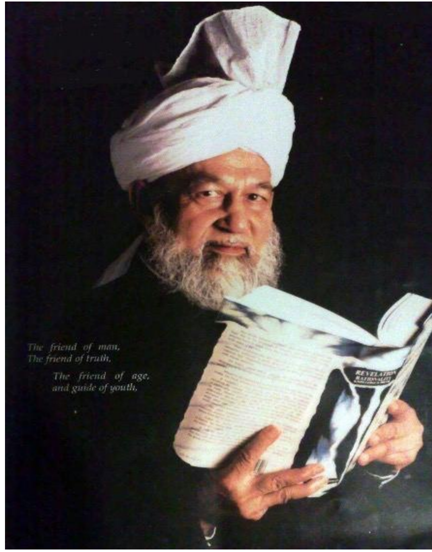
یادیں قیامت تھیں قلبِ تپاں کے لئے
پیار کے پھول دل میں سجائے ہوئے
نورِ ایماں کی شمعیں اٹھائے ہوئے
قافلے دور دیسوں سے آئے ہوئے
غمزدہ اک بدیس آشیاں کے لئے
دیر کے بعد اے دور کی راہ سے آنے
والو! تمہارے قدم کیوں نہ لیں
میری ترسی نگاہیں کہ تھیں منتظر اک
زمانے سے اس کارواں کے لئے
تم چلے آئے میں نے جو آواز دی
تم کو مولیٰ نے توفیقِ پرواز دی
پر کریں پَر شکستہ وہ کیا جو پڑے
رہ گئے چشمکِ دشمناں کے لئے
حبس کیسا ہے میرے وطن میں جہاں
پا بہ زنجیر ہیں ساری آزادیاں
ہے فقط ایک رستہ جو آزاد ہے
یورشِ سیلِ اشکِ رواں کے لئے

اس عظیم فقیرِ توحید پرست کے سیلِ اشکِ رواں کی یورشِ طوفاں نظیر کس طرح دعاؤں میں ڈھلی اور کس طرح عملاً سنگدل فرمانرواؤں کے بے رحم اور سنگلاخ فیصلوں کے ساتھ جیل خانوں کی

آہنی دیواروں کو بھی بہا کر لے گئی، ایک طویل داستان ہے۔ جو اپنی جگہ پیش ہو گی لیکن وہ کیفیتِ دردِ دل کیا تھی اور وہ طوفاں نظیر یورشِ دعا کیا تھی؟ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جو درد سسکتے ہوئے اشکوں میں بھرا
ہے شاید کہ یہ آغوشِ جدائی میں پلا ہے
ہیں کس کے بدن دیس میں پابندِ سلاسل
پردیس میں اک روح گرفتارِ بلا ہے
کس دن تم مجھے یاد نہیں آئے مگر آج
کیا روزِ قیامت ہے! کہ اک حشر بپا ہے
یارب یہ گدا تیرے ہی در کا ہے سوالی
جو دان ملا تیری ہی چوکھٹ سے ملا ہے
گم گشتہ اسیرانِ رہِ مولا کی خاطر
مدت سے فقیر ایک دعا مانگ رہا ہے
جس رہ میں وہ کھوئے گئے اس رہ پہ گدا
ایک کشکول لئے چلتا ہے لب پہ یہ صدا ہے
خیرات کر اب ان کی رہائی مرے آقا! کشکول
میں بھر دے جو مرے دل میں بھرا ہے
میں تجھ سے نہ مانگوں تو نہ مانگوں کا کسی سے
میں تیرا ہوں، تو میرا خدا میرا خدا ہے

آفاقیت



آپؒ کے کلام کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں آفاقیت پائی جاتی ہے کیونکہ وہ ایسے دل سے پھوٹتا ہے جو نہ مشرقی تھا نہ مغربی۔ اس میں عالمگیر جذبوں کی لَو ہے جو دعوت و پیامِ اسلام کی طرح افق تا افق ہے۔ چنانچہ وہ اگر پاکستان کے لئے چمکار دکھاتی ہے تو بوسنیا اور انڈونیشیا کے لئے بھی روشنی مہیا کرتی ہے۔ اس کی تابش اگر اپنے احمدیوں کے لئے راہیں روشن کرتی ہے تو دوسروں کے لئے بھی پرکاشی ہے۔ وہ بلا رنگ و نسل اور مذہب و ملت تمام پر یکساں نور فگن ہے۔

انقلاب خیزی

آپؒ کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ محض شاعری کی غرض کے لئے شاعرانہ سخن نہیں ہے بلکہ ایک ایسے میرِ کارواں کا پیام ہے جو ایک جارحانہ رَوپیش قدمی پر یقین رکھتا ہے اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا کلام بھی اپنے قبیلے کو سریع سرعت کے ساتھ پیش قدمی، بلند حوصلگی اور غلبے کی منازل کے حصول کے لئے عزم و اقبال عطا کرتا ہے۔

چونکہ حضرت صاحبزادہ صاحبؒ ایک انقلاب روزگار لیڈر ہیں۔ آپؒ کے شعر کے اسلوب اور آہنگ میں حیات افروز پیغام ہے اور اس میں جماعت کے ہر طبقے کے افراد کے دل دھڑکتے ہیں۔ آپؒ ایک سحر خیز شاعر ہیں لیکن آپؒ نے نفرتیں پھیلانے کی بجائے سچائی کے سازوں میں روحانیت کے تاروں پر پیار و محبت اور اخوت و وحدت بڑھانے والے گیت سنائے۔ آپؒ نے کاسہ اشعار میں آبِ زندگی پیش کیا اور دلوں کو روحِ تابانی سے ہمکنار کیا۔

آپؒ کے محاسنِ کلام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپؒ نے اس کے ذریعہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی احکام کے ترازو میں قوم کو اس کی برائیوں سے آگاہ کر کے نیکیوں کی طرف توجہ اور کشش دلائی ہے۔

مسیحانہ کلام

بالآخر آپؒ کی شاعری کی تاجوَری یہ ہے کہ اس میں شعراء کے علم و فن کا رسمی دخل نہیں ہے، بلکہ اس کا خمیر جس نادر چیز سے اٹھا ہے اس پر بھی وہی الہامِ الٰہی سند ہے جو اس دَور کے مسیح و مہدی کے کلام پر تھی کہ

"در کلامِ تو چیزے است کہ شعر آء را دراں دخلے نیست" (الہام حضرت مسیح موعود)

کہ تیرے کلام میں ایک خاص چیز ہے جس میں شعراء کو دخل نہیں ہے۔ پس آپؒ کی خلافت مسیحِ موعود کی خلافت ہے تو آپؒ کے شعر و سخن کو بھی اسی مسیحانہ شعر و سخن کی جانشینی کی جاگ لگی ہے۔ حضورؒ کا اللہ تعالیٰ سے جو تعلق تھا اسی ناتے سے جو کلام زبان پر جاری تھا اس کی بے ساختگی خود گویا ہے کہ وہ کسی چشمہ الوہیت سے جاری ہوا ہے۔ ربوہ میں آپؒ کے آخری جلسہ سالانہ 1983ء پر پڑھی جانے والی آپؒ کی مایہ ناز اور تاریخ ساز نظم کا ہر شعر اپنے اندر گویا ملاءِ اعلیٰ سے جاری شدہ عظیم الشان پیشگوئی کو سموئے ہوئے تھا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اسی الہام کی طرف اشارہ کر رہا تھا "یَأْتِیْ عَلَیْکَ زَمَنٌ کَمِثْلِ زَمَنِ مُوْسٰی" کہ تجھ پر ایک ایسا

زمانہ آنے والا ہے جیسا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آیا تھا۔ حضورؒ نے اس نظم میں جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا:

دو گھڑی صبر سے کام لو ساتھیو!
آفتِ ظلمت و جور ٹل جائے گی
آہ مومن سے ٹکرا کے طوفان کا رخ
پلٹ جائے گا رُت بدل جائے گی
تم دعائیں کرو یہ دعا ہی تو تھی
جس نے توڑا تھا سر کبرِ نمرود کا
ہے ازل سے یہ تقدیر نمرودیت
آپ ہی آگ میں اپنی جل جائے گی
یہ دعا ہی کا تھا معجزہ کہ عصا
ساحروں کے مقابل بنا اژدھا
آج بھی دیکھنا مردِ حق کی دعا
سحر کی ناگنوں کو نگل جائے گی
ہے ترے پاس کیا گالیوں کے سوا
ساتھ میرے ہے تائیدِ رب الوریٰ
کل چلی تھی جو لیکھوؔ پہ تیغِ دعا
آج بھی اذن ہوگا تو چل جائے گی

اس نظم میں جہاں جماعت پر ظلم ڈھانے والے ظالموں کے لئے انذار کا پہلو ہے وہاں اپنی جماعت کے لئے الٰہی تبشیر کی گھٹائیں بھی امڈتی ہیں۔ بہرحال اس میں جس پیشگوئی کا ذکر تھا، وہ کس

شان سے پوری ہوئی یہ ایک الگ داستان جو دنیا نے سنی بھی اور مشاہدہ بھی کی۔ یہ ساری داستان شاہد ہے کہ آپؒ کے کلام میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے کہ عام شعراء کا اس میں دخل نہیں ہے۔

اساتذہ فن کے کلام کا فہم وادراک

شعر و سخن کے عام اور رسمی فن پر بھی حضرت صاحبزادہ صاحبؒ کی دسترس انتہا کی ہے۔ عام شعراء کے کلام کی کنہ تک تو اکثر لوگ پہنچ جاتے ہیں۔ مگر استادہائے شعر و سخن کے کلام کے سربستہ زاویوں اور کونوں کھدروں میں مخفی رازہائے قلب و نظر کی خبر پانا ہر ایک کی رسائی میں نہیں۔ اس کے لئے فنِ شعر کے گہرے ادراک کے ساتھ نورِ فہم و فراست بھی درکار ہے۔ حضرت صاحبزادہ صاحبؒ عطائے الٰہی کے ساتھ ان تمام ہتھیاروں اور صلاحیتوں سے لیس، شاعری کے جملہ اسرار سے آشنا اوراس کے مخفی پہلوؤں سے بھی آگاہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری کے حسن و نکھار سے لذت بھی بلا کی اٹھاتے ہیں۔

جنوری 1981ء کی بات ہے، حضرت شیخ محمد احمد مظہرؓ ربوہ تشریف لائے اور دار الضیافت میں قیام فرما ہوئے۔ آپؓ نے حضرت صاحبزادہ صاحبؒ سے خواہش کی کہ آکر مل جائیں۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے حضرت صاحبزادہ صاحبؒ اپنا حال بیان فرماتے ہیں:

"بعض مجالس کے تاثرات پھولوں کی خوشبو کی طرح ہوتے ہیں۔ ان پھولوں کو کھِلے ہوئے کچھ دیر گزر جائے تو وہ بات نہیں رہتی۔ مختلف موضوعات پر فارسی کے بلند پایہ شعراء کا منتخب کلام انہوں نے سنایا۔ کئی مرتبہ تو قدم قدم روَش روَش ان کے ساتھ چلتا رہا اور وہ انگلی اٹھا اٹھا کر شعروں کے اس چمن کے مختلف گوشوں کا حسن مجھے دکھاتے رہے۔ جیسے یورپ میں شوکی آور فائزہ کو میں قدرت کے حسین مناظر دکھایا کرتا تھا۔ یا جیسے وُلزے پارک انگلستان میں درختوں کے جھرمٹ سے جھانکتی ہوئی بے حد حسین و دلکش پھولوں کی کیاریاں دیکھ دیکھ کر انہیں متوجہ کرتا تھا کہ دیکھو وہ بھی وہ بھی دیکھو وہ بھی تو دیکھو۔ لیکن شعروں کی دنیا کی اس سیر میں بسا اوقات شیخ

صاحب آگے نکل جاتے اور میں کسی ایک شعر کے حسن میں ڈوب کر کھویا جاتا۔ جیسے کسی پھول کا در کھلا دیکھ کر بھنورا اس میں ڈوب جاتا ہے۔ شعر کے اس دریچے کے اس پار مجھے حسن کا ایک جہاں نظر آتا جس کی میں تنہا سیر کرتا رہتا۔ ایسی ہی ایک تنہا سیر کے دوران میں نے سوچا کہ میں بھی تو تضادات کا مجموعہ ہوں، ساتھی ہوں تو تنہائی کو ترستا ہوں۔ تنہائی ملے تو ساتھی ڈھونڈتا ہوں۔ آخر یہ پاگل من چاہتا کیا ہے۔ کسی چیز پر بھی راضی نہیں ہوتا۔ بے چین بچہ ضدی کہیں کا۔ کھلونا نہ ہو تو کھلونے کو روئے، کھلونا دو تو پٹخ کر اس ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے ٹکڑوں پر واویلا کرنے لگے۔ میں نے سوچا انسان ناشکرا اپنے رب سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے۔ تبھی تو بار بار اسے کہنا پڑتا ہے فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ زندگی دیتا ہوں تو موت مانگنے لگتے ہو، موت دیتا ہوں تو زندگی کی دُہائی دینے لگتے ہو۔ آخر میری کن کن نعمتوں کی تم تکذیب کرتے چلے جاؤ گے۔

پس ایسے کئی بار ہوا کہ میں کسی ایک پھول کی سیر میں کھویا گیا اور شیخ صاحب آگے نکل گئے اور پھر مجھے پیچھے مُڑ کر اس طرح آوازیں دے کر بلایا جیسے بچہ سیر کے دوران پیچھے رہ جاتا ہے تو ماں باپ ٹھہر ٹھہر کر اسے بلاتے رہتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آج سیر کرانے والے نے زیادہ سیر کی یا اس نے جسے سیر کروائی جارہی تھی۔ حضرت اقدس مسیحِ موعود علیہ السلام کا ایک ایسا پیارا شعر انہوں نے سنایا تو اس کی سیر میں جو کھویا گیا تو بہت دور نکل گیا۔ ادھر شیخ صاحب سارے چمن کی سیر کر کے مجھے ڈھونڈتے ہوئے واپس لوٹے تو وہیں ملا جہاں مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔"

یہ واقعہ حضرت صاحبزادہ صاحبؒ کے ذوقِ شعر کی پاکیزگی اور ادراک کی رفعت کا عکاس ہے۔ جس گہرائی اور سچائی کے ساتھ آپؒ مشکل سے مشکل ترین شعر کی تہہ میں آسانی سے اتر کر سیراب ہو لیتے تھے، یہ آپؒ ہی کا مقسوم تھا۔ اس میدان میں آپؒ یکتا ہیں۔

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 13/اپریل 2022ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا وصفِ شعر و سخن

(قسط دوم)

مرزا غالبؔ اور آپؒ

چنانچہ 1979ء میں حضرت صاحبزادہ صاحبؒ نے خدام الاحمدیہ مرکزیہ کی درخواست پر سرائے خدمت میں "مرزا غالبؔ" کے موضوع پر ایک فی البدیہہ قسم کا لیکچر دیا تھا۔ اس کے کچھ حصے ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں۔ یہ لاثانی مضمون اپنی مثال آپ ہے اور تاریخِ ادبِ اُردو میں غالبؔ کے اشعار کی خوبصورت اور لطیف تشریحات پر مشتمل ایک منفرد شاہکار ہے۔ اگر غالبؔ کی شاعری فطرت، فراست، نفسیات، تصوف اور قدرت کے دقیق سربستہ رازوں کو سموئے ہوئے ہے تو یہ تشریحات ان رازوں کے عمیق کونوں کھدروں کو سرِ عام اور بے دھڑک بے نقاب کررہی ہیں۔ صلاحیتِ سخن اور سخن فہمی آپؒ کو منبع فیض سے بدرجۂ کمال حاصل تھی۔ غالبؔ پر مشکل پسندی کا اعتراض کرنے والوں کے جواب میں اس نے خود یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مگر حضرت صاحبزادہ صاحبؒ بعض دفعہ اس کا کہا ہوا اس طرح کہہ جاتے کہ گویا اس کے دل و دماغ کا سب کچھ آپؒ جانتے ہیں۔ اس کا کہا ہوا ہر مشکل شعر جب آپؒ بیان کرتے ہیں تو وہ آسان ہو جاتا ہے۔ آپؒ غالب کو ہر سننے اور پڑھنے والے کے قریب کر دیتے ہیں۔

یہ سچ تو اپنی جگہ ہے مگر ان تشریحات کی اوٹ میں حضرت صاحبزادہ صاحبؒ کی ذات کے کئی پہلو بھی اپنے اندر اپنی دلآویز تابناکیوں اور جلووں کے اظہار کے ساتھ آپؒ کی اپنی شاعری کے علو و ارتقاع کو پیش کر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی عیاں ہے کہ جو خوبیاں آپؒ نے غالبؔ کے کلام کی پیش فرمائی ہیں، ان سے آپؒ کا اپنا کلام بھی خوب مزین ہے۔ یہاں ان کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں مگر ان پر غور کرنے والا ہر صاحبِ ذوق و فن اپنے اپنے ظرف و ادراک کے مطابق غیر معمولی خوبیاں اور حسن و بُو ملاحظہ کرتا ہے۔ الغرض غالبؔ کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے آپؒ نے فرمایا:

"خدام الاحمدیہ نے نوٹس دیا ہوا تھا لیکن دو دن پہلے خالد مسعود (ملک خالد مسعود صاحب) نے مجھے دیوانِ غالبؔ لا کر دیا اور وہ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر چلتا رہا۔ موقع نہیں ملا مجھے دیکھنے کا۔ آج شاہ صاحب تشریف لائے تو انہوں نے نوٹس دیا لیکن دوسرے مہمان آگئے۔ چار بجے کھولا تو الف کی پٹی بھی ابھی پوری نہیں پڑھی تھی کہ نماز کا ٹائم ہو گیا۔ پھر میں نے جلدی جلدی میں نماز کے اور اس وقت کے دوران یاد سے کچھ شعر لکھ لئے ہیں۔ تو آپ لوگوں کا وہی حال نہ ہو کہ

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عذر سے میں نے بات شروع کی ہے لیکن غالبؔ کے ہاں عذر کا کوئی دستور نہیں۔ لیکن وہ ایک ایسا شاعر ہے کہ اپنے خلاف ایسے ایسے مضمون تراشتا ہے اور ایسی گہری نظر سے اپنے نفس کا تجزیہ کرتا ہے کہ جہاں دوسروں کو گناہ نظر نہیں بھی آتا وہاں اس کو نظر آجاتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

لوگ تو کہتے ہیں کہ جی بوڑھا ہو گیا تو نیک ہو گیا اور چلو یہی سہی۔ آخری عمر میں تو کچھ نیکی کی اس نے۔ لیکن غالبؔ کے ہاں یہ بیچارگی کے مترادف ہے۔ اور حقیقت میں وہ اس فلسفہ کو خوب سمجھتا ہے کہ گناہ تو وفورِ جذبات کے وقت نفس کو روکنے کا نام ہے نہ کہ بے اختیاری کی حالت میں معصومیت کا نام۔ اس کے علاوہ بھی وہ بعض ایسی باتیں کرتا ہے جو دنیا کے ادب میں کسی شاعر نے اپنے خلاف نہ کہی ہوں گی۔ مثلاً کہتا ہے کہ ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا ربّ! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ناکردہ گناہ، پکڑے جانے کے شکوے جو آپ کو دُنیا کے ہر ادب میں ملیں گے۔ لیکن ناکردہ گناہوں کو اپنے جرموں میں شمار کرنا یہ ایک ایسا استثنائی کلام ہے جو میرے علم کے مطابق محدود ہے۔ وہ غالبؔ کے سوا کہیں اور نظر نہیں آتا۔ سارے کلام میں مجھے صرف ایک عذر اس کا ملا ہے جو اس کے نزدیک درخورِ اعتنا ہے۔ اور وہ بھی عذر کا نہ ہونا ہے۔ کہتا ہے ؎

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

سب سے مضبوط عذر جو اس کو ملا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ملا کہ وہ عذر کوئی نہیں کرتا ایک تو اپنے گناہوں سے واقف بھی نہیں اور ان کے خلاف کسی قسم کی حجت تلاش نہیں کرتا۔ اس تمہید کے بعد جو شعر میں نے جلدی جلدی گھسیٹے ہیں ان کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

غالبؔ کے ہاں بعض تصویریں ملتی ہیں۔ وہ ایک نقّاش ہے، ایک مصوّر ہے۔ اور آواز کے بغیر جو اس نے تصویر کشی کی ہے وہ بہت ہی خوبصورت طرزِ بیان ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ ؎

مدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

اس پر غور کریں اس کے مضمون میں ڈوب کر بہت ہی حسین دلکش نظارہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ وہ مدّعا جو دل کی زینت تھا وہ جب حسرت میں تبدیل ہوا اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا تو ہر ذرّہ دل میں وہ مدّعا قطروں کی طرح چمکنے لگا۔ آئینہ خانہ اس جگہ کو کہتے ہیں......... لوگ آئینہ خانے میں جاتے تھے تو ہر طرف شیشے میں ایک کی بجائے سینکڑوں تصویریں ایک دوسرے سے ٹکر کھاتی نظر آتی تھیں تو کہتا ہے وہ مدعا جو کبھی دل کی زینت تھا اس کی شکست کے نتیجے میں دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا اور ایک مدعا نہیں ہر ٹکڑے میں اس مدّعا کو اپنی تصویر نظر آرہی ہے۔ ایک بہت ہی حسین تصویر کشی ہے غالبؔ کی۔ کچھ سادہ الفاظ میں کچھ مشکل طرز میں۔ سادہ الفاظ میں اس کی تصویر کشی کے مناظر میں سے دو پیش کرتا ہوں۔

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

محو آئینہ داری میں لفظ محویت میں یہ بتایا کہ دیکھنے والا خود اپنے حسن میں محو ہو گیا ہے، گم ہو گیا ہے، متأثر ہے اور اس کو یہ بتانے کا اس سے اچھا کیا موقع ہے کہ تمہارا اپنا یہ حال ہے تو ہم جو غیر نظر سے تجھے دیکھ رہے ہیں اور تیری محبت میں مبتلا ہیں ہماری کیا کیفیت ہوئی ہو گی۔ کچھ اندازہ کرنے کا یہ بہت اچھا وقت ہے کہ جو دوسرے تجھے پیاری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر تیرا کیا اثر ہوتا ہو گا اس مضمون کو نسبتاً ہلکے رنگ میں ایک اور طرح غالبؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

"اپنا سا منہ لے کے رہ گئے"۔ ایک اور حُسن ہے جو اس میں نہیں ہے کہ اپنا سا منہ لے کر رہ جانا ایک طرف تو شرمندگی اور دوسری طرف شرمندگی اس بات پر کہ ہم تو اتنے خوبصورت ہیں

کہ خود اپنے ہی حسن کا شکار ہو گئے۔ اس ’’اپنا سامنہ‘‘ میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ ایک اور یعنی محض تحسین کا کلمہ نہ رہا بلکہ تعریف کی انتہا ہو گئی۔ آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے کہ آئینے میں اپنے ہی سامنہ نظر آیا کرتا ہے۔ تو ایک نہیں بلکہ کئی پہلو ہیں حسن کے اور یہی غالبؔ کی خصوصیت ہے کہ جو بات کہتا ہے اُسے الٹ پلٹ کے دیکھیں تو ہر زاویے سے ایک نیا حسن نظر آتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ

تُو اور آرائش خَمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

ہائے دور دراز سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک خاموش تصویر ہے۔ ایک شخص آرائش خمِ کاکل میں محو ہے اور دوسرا اندیشہ ہائے دور دراز میں ہے۔ اور اندیشہ کو ظلمات سے ایک نسبت ہے۔ اندھیرے اور کاکل میں بھی ایک ظلمت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اور خم میں بھی پیچیدگی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ تو ہر لفظ دوسرے کے ساتھ اس خوبی کے ساتھ منطبق ہو رہا ہے کہ حسن میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔



پردے اور حجاب کے ذکر میں ایک یہ شعر بھی میرے ذہن میں آیا جو بہت ہی اُونچے درجے کا ہے۔ خدا تعالیٰ کی ہستی کو مخاطب کر کے غالبؔ کہتا ہے۔

محرم نہیں ہے تُو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہاں حجاب اور پردے کے مضمون کو آپس میں ایک دوسرے کے مقابل اس طرح باندھا گیا ہے کہ حجاب، حجاب کا کام نہیں دے سکتا بلکہ بے حجابی کے کام آرہا ہے۔ کیونکہ پردہ ساز آواز کے اٹھانے کے لئے کام آتا ہے اور بظاہر نام پردہ ہے لیکن حقیقت میں اس سے سوز کے مخفی اور گداز جذبات صوتی شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ بظاہر محرم ہائے راز تو تُو ہی ہے لیکن جو پردہ بھی تیری راہ میں حائل ہے جب ہم اس پردے کا نظارہ کرتے ہیں تو تیرے حُسن کی تصویر ابھرتی ہے اور تیری ذات کا تصور عجیب رنگ میں ہماری آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔

غالبؔ کے ہاں ارتقائی تصوّرات بھی ملتے ہیں۔ ڈارون والا ارتقاء نہیں بلکہ سوچ کا ارتقاء اور ایک چیز پر نہ ٹھہرے رہنا بلکہ اُس سے آگے، اس سے آگے کی تلاش اور جستجو اور اس چیز کو اپنے محبوب میں بھی دیکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسنِ کامل کا جو تصور ہے اس میں ٹھہراؤ کوئی نہیں اور اگر حسن میں ٹھہراؤ ہو تو عشق زائل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت ہی بنیادی نکتہ ہے کہ عشق میں اگر دوام چاہئے ہو تو حسن میں بھی ایک مسلسل ترقی کی جانب حرکت ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ حقیقی عشق صرف خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں کیونکہ اس کے سوا کسی حسن میں بھی مستقل حرکت اور ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کی کیفیت نہیں پائی جاتی ہے۔ جس کو قرآن کریم یوں بیان فرماتا ہے:

''کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ ''

اگر خدا تعالیٰ کے حسن کا ایک ہی جلوہ ہمارے سامنے رہتا تو باوجود اس کے کہ وہ جلوہ کامل ہوتا پھر بھی تم بور ہو جاتے کیونکہ ہم نے انسانی فطرت کو ٹھہراؤ کے لئے پیدا نہیں کیا۔ کن کن نعمتوں کا تم انکار کرو گے کہ خدا تعالیٰ اپنے حسن کا بھی صرف ایک جلوہ تمہارے سامنے نہیں رکھتا۔ کبھی کسی جلوے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کبھی کسی جلوے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ غالبؔ اس تصور کو زبردستی اپنے محبوب پر ٹھونستا ہے۔ بات اس کی سچی نہ سہی لیکن راز جو پا گیا وہ درست ہے۔ کہتا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تو ایک مقام نہیں ہے جہاں میرا محبوب اپنے حسن پر تسلی پا جائے۔ یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ محبوب کا ذوقِ نظر بھی بہت بلند دکھایا گیا ہے۔ صرف حسن نہیں یعنی محبوب کا ذوق خود اس راز کو جانتا ہے کہ کسی ایک مقام پر بھی میں ٹھہر گیا تو میں پرستش یا پیار کے قابل نہیں رہوں گا۔ کہتا ہے۔ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں۔ ہمیشہ جستجو رہتی ہے کہ میں پہلے سے بہتر اور بہتر تر ہوتا چلا جاؤں۔ یہی تصور اس کے ہاں کائنات کی جستجو میں ملتا ہے، غالبؔ کے ہاں۔ کہتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

بعض دیوانوں میں "اِدھر" لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ مراد یہ ہے کہ انسان کو جو بھی جگہ ملے سوچ اور فکر کی وہ اس کی زمین بن جاتی ہے اور انسانی فطرت ہے کہ اس کے اوپر آسمان ضرور بنایا جائے۔ کہتا ہے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اسی مضمون کو ایک اور رنگ میں باندھتا ہے لیکن اس میں ایک سراب کی کیفیت پیدا کر کے ایک حسرت کی اک نہ ختم ہونے والی جستجو کی۔ کہتا ہے

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا ربّ!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کی سوچ کتنی لطیف، کتنی گہری اور کتنی ہمہ گیر تھی اور اس کی نظر کتنی باریک تھی اور وسعتوں میں لامتناہی تو نہیں ہم کہہ سکتے ہیں لیکن اتنی وسعتیں ہمیں ضرور نظر آتی ہیں کہ عام انسانی ذہن ان کا تصور نہیں کر سکتا۔ کہتا ہے

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب

یہ سارا دشتِ امکاں کہہ کر اسے سراب کے مضمونِ بند میں پیش کیا کہ ہر امکان جو اس کائنات میں ہمیں دکھائی دے رہا ہے جہاں ہم تلاش کرتے ہیں، اپنے ماحَصل کو، اپنے منتہیٰ کو، اپنے مدعا کو یہ ایک دشت ہے۔ اس میں ملتا کچھ نہیں۔ لیکن اس جستجو کا ضرور کوئی نہ کوئی اگلا قدم تو ہونا چاہئے۔ تو یہ تو پہلا قدم ہے جو دشتِ امکاں میں ہمیں نظر آیا تمنا کا۔ اور وہ دوسرا قدم کہاں ہے جہاں ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔ یہ انسانی فطرت کی نہ ختم ہونے والی جستجو، نہ ختم ہونے والی پیاس کو اس سے زیادہ حسین رنگ میں میرے خیال میں شاید ہی دنیا کے کسی شاعر نے بیان کیا ہو۔ کم سے کم میں نے جیسا کہ عرض کیا تھا میرے محدود علم میں اس شعر کی کوئی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔

غالبؔ کے ہاں شکوہ بھی ملتا ہے اور جواب شکوہ بھی لیکن صرف دو شعروں میں۔ جس مضمون کو اقبالؔ نے دو کتابوں کی شکل میں، اشعار کے دو گلدستوں کی شکل میں پیش کیا۔ اس کو انتہائی شدّت کے ساتھ اور ٹھسے ہوئے مضمون کے ساتھ غالبؔ نے دو شعروں میں بیان کر دیا اور دونوں میں انسان کے لئے ایسا مواد موجود ہے کہ ہر شعر اپنی ذات میں اس کو راضی کر لیتا ہے۔ اتنی

قوی دلیل اور ایسے جذبے کی بے اختیاری اور شدت اپنے اندر رکھتا ہے کہ دونوں کے اندر توازن پایا جاتا ہے۔ اقبال کے اوپر تنقید کرنے والے کہتے ہیں کہ شکوہ میں تو زور ہے لیکن جواب شکوہ میں وہ زور نہیں اور وہ پلڑا جو ہے وہ ہلکا اور اُوپر اُٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ غالبؔ کا شکوہ اپنے ربّ سے یہ ہے کہ

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جذبے کا اتنا شدید اظہار، اتنی قوّت اور زور کے ساتھ۔ مجھے دریائے بیاس یاد آجاتا ہے۔ جو ہم کئی دفعہ اس کا دَہانہ دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ تو جہاں وہ تنگ ہو جاتا ہے بہت اور غاروں اور چٹانوں کے بیچ میں سے رستہ نکال کے گزرتا ہے وہاں اس کے اندر بے انتہا شدّت پائی جاتی ہے، بہت زور پایا جاتا ہے تو اس جذبے کو ایک چیختی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ساری عمر بندگی کی اور کچھ نہیں پایا۔ آخر وہ کیا خدا تھا جس کی ہم پرستش کرتے رہے۔ جواب سنئے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کیسا پیارا جوابِ شکوہ ہے۔ وہ کیا بندگی تھی، کیا کیا کچھ ہم نے خدا کے لئے کیا۔ جب اس پہ نظر ڈالتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اپنے پاس سے کچھ نہیں لائے۔

سب کچھ تیری عطا ہے
گھر سے تو کچھ نہ لائے

اُس مضمون کو یہ اپنے رنگ میں باندھ رہا ہے۔ ہمارے پاس تھا کیا۔ جو کچھ تھا وہ خدا ہی نے دیا ہوا تھا اور وہ سب کچھ بھی ہم اس کی راہ میں دے نہ سکے۔ ساری عمر گناہوں میں مبتلا رہے۔ غیر اللہ کی طرف بھاگتے رہے۔ اپنی خواہشات کو اِلٰہ بنائے رکھا اور آخر پر کیا نکلا، جان ایک رہ گئی تھی وہ دے دی اور بڑا کمال کر دیا۔ تو؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان تو دے دی واپس لیکن جان کا حق ادا نہیں ہوا۔ یہ ہے اس میں مضمون۔ جان نے جو فرائض، جو مطالبے ہم پر عائد کئے تھے، جو تقاضے قائم کئے تھے ان میں سے کسی تقاضے کو پورا نہیں کر سکے۔ امانت اسی طرح لوٹا دی ہے۔ اس سے زیادہ ہم نے کوئی بندگی نہیں کی اور جان دینا بظاہر بندگی کی انتہا سمجھا جاتا ہے۔ پس اِس مضمون میں جو بظاہر کتنا سادہ اور آسان شعر ہے لیکن اِس میں بہت ہی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی قسم کے بہت سے ہیں موازنے۔ غالبؔ نے ایک ہی مضمون کو مختلف رنگ میں بیان کیا ہے۔ کہیں نرمی اور پیار کے ساتھ اور اس میں حسرت کا پہلو اور ملائمت پائی جاتی ہے اور کہیں شدّت اور زور کے ساتھ اور وہاں بھی اسی طرح دریا کا سا منظر آتا ہے کہ دریا جب پھیل جاتے ہیں تو ان میں ایک خاموشی پائی جاتی ہے اور بہت ہی سکون کا منظر نظر آتا ہے لیکن جب وہ تنگ ہو کر رستہ نکالتے ہیں تو اُن میں شدت پائی جاتی ہے۔ انسانی فطرت بھی کائنات کی طرح کے نظارے اپنے اندر رکھتی ہے....

غالبؔ کے ہاں جہاں تصوّف کے مضامین پائے جاتے ہیں وہاں ایک قسم کی چالاکی اور ہوشیاری بھی پائی جاتی ہے اور اس کے تصوّف میں اپنے گناہ اور شراب اور یہ سب چیزوں کا مضمون سمویا جاتا ہے۔ اکثر یہی دیکھا گیا ہے۔ اس کی ایک بہت پیاری مثال یہ ہے۔ کہتا ہے؎

سرپائے خم پہ چاہئے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہئے

سرپائے خم پہ چاہئے ہنگامِ بیخودی۔ ''کُلَّ یَوْمٍ ھُوَفِیْ شَاْنٍ'' کا ایک یہ جواب ہے۔ اس نے اپنی طرف سے تراشا ہے۔ کہتا ہے خدا کی صفات جو ہیں ان کے مختلف جلوے ہوتے ہیں۔ یہ پیمانے میں اور خم میں جو چیز ہم پیتے ہیں یہ کہاں سے آئی۔ یہ کیف و مستی یہ خدا ہی کی تو تخلیق ہے۔ اس لئے خدا کی صفت جہاں بھی نظر آئے سرپائے خم پہ اس وقت انسان کو صفاتِ باری تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہئے۔

رُو سُوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہئے

جب عبادت کا وقت ہو تو وہی رُخ سوئے قبلہ کر لیا کرو اور دلیل سنئے۔

یعنی بحسبِ گردش پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

کیسا پیارا مضمون باندھا ہے اس نے شراب کی گفتگو میں۔ 'بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر' کا یہ ایک ثبوت ہے۔ کہتا ہے۔ 'یعنی بحسبِ گردش پیمانہ صفات' یعنی صفات باری تعالیٰ کا پیمانہ ہر وقت گردش میں ہے اس کے مطابق فعل کیا کرو۔ یہ نہ ہو کہ مے نوشی کا وقت ہو اور تم نمازوں میں مبتلا ہو جاؤ۔ یہ فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے کیونکہ یہ قضائے حال کے منافی ہو گا۔ اس لئے جب صفات باری تعالیٰ ایک خاص رنگ میں پیش ہوں۔ جب بادل اٹھ رہے ہوں، جب گھٹا آئی ہو، تو اسی طرح کا اظہار تم کیا کرو اور مے نوشی کے وقت مے نوش ہو جاؤ۔ ہاں ذات باری تعالیٰ کا تصوّر ہمیشہ پیش نظر رہے۔ سر وہاں بھی خدا کے حضور جھکنا چاہئے کیونکہ اُسی کی صفات ہیں جو سارے نظارے پیش کر رہی ہیں۔

عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہئے

غالبؔ کے ہاں مختلف جگہ بکھرے ہوئے سوال اور ان کے جواب بھی ملتے ہیں۔ اور جتنی بھی فصیح و بلیغ کتابیں ہیں اور فصیح و بلیغ کلام ان میں یہ بات آپ کو نظر آئے گی کہ ضروری نہیں کہ سوال اور جواب اکٹھے ہوں۔ ایک سوال اپنا لطف دے جاتا ایک الگ جگہ اور ایک جواب اپنی جگہ الگ آتا ہے اور وہاں لطف دے جاتا ہے۔ جب ان کو آپ جوڑ کر دیکھیں تو تب سمجھ آتی ہے کہ سوال کیا تھا، جواب کیا ہے۔ ایک Situation ہے، ایک صورت حال ہے۔ جسے غالبؔ یوں بیان کرتا ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا ربّ
کوئی آبلہ پا وادی پُرخار میں آوے

کہ زبانِ حال سے سوکھی ہوئی زبان فریاد کر رہی ہے کہ پیاس سے سوکھ گئے ہیں۔ کوئی آبلہ پا آئے، کوئی ایسا رحم دل انسان ظاہر ہو جو اپنے خون سے ہماری آبیاری کرے اور اپنے آبلے پھوڑے ہمارے لئے۔ یہ مضمون اپنی ذات میں بہت گہرا ہے۔ بسا اوقات زمانوں پر ایسی کیفیتیں آیا کرتی ہیں کہ ان کی زبانیں سوکھ کے کانٹوں میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں تو آبلہ پا ہی ہیں جو ان کی پیاس بجھاتے ہیں اور ان کو پھر چمن زاروں میں تبدیل کیا کرتے ہیں۔ اس کا جواب اب سنئے۔ غالبؔ کہتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

وہ آبلہ مَیں ہی تو تھا جس کی تمنا کی جارہی تھی۔ جس کے لئے آواز بلند ہو رہی تھی۔ تو میرا دل ان کانٹوں کو دیکھ کر خوش ہو گیا ہے۔ اب یہ بظاہر تو دنیا کی کیفیت ہے مگر حقیقت میں یہ وجود میں صرف اسی وقت آتی ہے، ظاہر میں جب انبیاء دنیا میں تشریف لایا کرتے ہیں۔ وہی ہیں جو حوصلہ رکھتے ہیں کانٹوں کی پیاس بجھانے کا اپنے آبلوں سے۔ اور وہ اس چیلنج کو قبول کرتے ہیں، بے

دھڑک وادی پُر خار میں قدم رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آ گئے ہیں ہم۔ اب جو تم نے کرنا ہے کرو۔ ہماری طرف سے تمہیں خیر ہی پہنچے گی اور ہم تمہاری پیاس بجھانے کی کوشش کریں گے خواہ اس میں ہمارا لہو پانی ہو جائے۔

غالبؔ کے ہاں فطرت کے گہرے راز عام سادہ الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بسا اوقات غالبؔ کے ساتھ یہ زیادتی کی جاتی ہے کہ ان کا سطحی نظارہ کر کے لوگ آگے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان شعروں میں بہت ہی گہرے فطرت کے راز پائے جاتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو پھر پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ مثلاً عام سا ایک شعر ہے کہ

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہِ کنعاں ہو گئیں

یہ پہلے مصرعے اور دوسرے مصرعے میں جو فرق دکھایا گیا ہے اسی میں ذرا تضاد ہے کہ کیا وجہ تھی اور رقابت کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا بیان کیا جارہا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ فطرتی بات ہے کہ سب لوگ رقیبوں سے ناخوش ہوتے ہیں اور وہ کیا بات تھی، وہ کیا فرق تھا کہ 'ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہو گئیں'۔ مراد یہ ہے کہ رقابت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو صرف یہ خوف جو عاشق کے دامن گیر ہوتا ہے یہ رقابت کو پیدا کرتا ہے کہ ہماری بجائے محبوب کی توجہ دوسری طرف نہ ہو جائے۔ اگر محبوب اس سے بالا ہو اور یہ ناممکن ہو کہ اُس کی توجہ کسی اور کی طرف بھی ہو سکے تو یہ رقابت نہیں بلکہ ایک لطف محسوس ہوتا ہے انسان کو کہ یہ بھی اس کی تعریف میں ہے جس کی تعریف نے مجھے پاگل بنا رکھا تھا تو 'ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں' میں ماہ کا تصوّر دیکر ایک اور لطف پیدا کر دیا۔

ماہ میں ایک دوری پائی جاتی ہے اسے پایا نہیں جا سکتا، اس کو پکڑا نہیں جا سکتا، چھوا نہیں جا سکتا تو حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حسن ان عورتوں کے لئے ماہ کی طرح تھا اور وہ اس سے لطف

اندوز تو ہو سکتی تھیں لیکن وہ اُسے اپنا نہیں بنا سکتی تھیں زلیخا سے چھین کر۔ پس یہی مضمون اس میں بیان ہوا کہ جب بھی محبوب کسی دوسرے کی دسترس سے بالا ہو جائے یا اس کے حصے کا پیار لے کر کسی دوسرے کو دینے کا امکان یا احتمال باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں پھر رقابت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس مضمون میں اگر آپ اور آگے بڑھیں تو آپ کو اللہ تعالیٰ کے عشق میں رقابت کے نہ ہونے کا مضمون سمجھ آجائے گا۔

ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اپنے محبوب سے محبت کا مطالبہ کرتا ہے اور جب ظرف بھر جائے تو اس کو کوئی پرواہ نہیں رہتی کہ وہ محبت کسی اور کو ملتی ہے یا نہیں جہاں ٹکراؤ ہو ظرف کے بھرنے یا نہ بھرنے کا کسی اور ظرف کے ساتھ وہاں رقابت پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ظرف اتنا محدود ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پیار اور محبت کو پاکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اپنے لئے ساری محبت کھینچ لی ہے۔ بیک وقت اس کی محبت کے جلوے بے شمار ہیں جو انسان اپنی ذات میں سمو ہی نہیں سکتا۔ اس کا دل بھر بھی جائے تب بھی اور دل بھرنے کے لئے باقی ہوں گے۔ لاکھوں کروڑوں یا ہزاروں کروڑوں ایسے دماغ اور دل ہوں گے جن کو خدا تعالیٰ اپنی محبت اور پیار سے نواز سکتا ہے۔ وہ خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے محبوب کی تعریف میں اور بھی لوگ دیوانے ہوتے جارہے ہیں۔

غالبؔ کے ہاں لفظوں پر بند جس کو کہا جاتا ہے وہ اپنے کمال کو پہنچا ہوا ہے اور ایک لفظ مختلف معنوں میں ایسا چسپاں ہوتا ہے کہ جس طرح کسی ماہر نے نگینے جڑے ہوں اور ان کو اپنی جگہ سے ہلایا نہ جاسکے۔ اس طرح بیٹھتے ہیں کہ ان کے رُخ پلٹنے کی بھی پھر مجال نہیں پاتا۔“

اسی طرح آپؒ نے اس موقع پر بھی غالبؔ کے مزید اشعار پر تبصرے فرمائے اور ان کی تشریحات بیان فرمائیں اور بعض اور وقتاً فوقتاً مواقع اور مناظر پر بھی انہیں چسپاں کیا۔ ان کا ذکر اپنی اپنی جگہ پر ہوتا رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ (ملخّص از ماہنامہ خالد ربوہ ”سیّدنا طاہر نمبر“)

پھر ایک اور زاویئے سے بھی آپؒ نے غالبؔ کی شاعری کے ذریعہ اس کی نفسیات اور قلبی کیفیات کی تجزیہ نگاری فرمائی ہے۔ جس سے یہ اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ حضرت خلیفۃ المسیح

الرابعؒ شاعر کے صرف فنِ شعر یا مضمونِ شعر کے ادا و نوا شناس ہی نہیں تھے، بلکہ اس کی امراض و نفسیات کے بھی رمز شناس تھے۔ آپؒ کی شاعری اور طبابت کے مرکّب پر مشتمل یہ ایک دلچسپ تجزیہ ہے جس کا ذکر طبابت والے باب میں گزر چکا ہے۔

میر تقی میرؔ کو خراجِ تحسین

پھر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ، میر تقی میرؔ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”میر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے سے اس طرح اونچے نکلے ہیں کہ زمانہ نیچے دکھائی دیتا ہے۔ اونچا بھی اور آگے بھی نکل گئے۔ میرؔ کے شعر پڑھیں تو لگتا ہے آج ہی کسی نے کہے ہیں۔ زبان ایسی چست اور اعلیٰ درجہ کی کہ انسان یہ سوچتا بھی نہیں کہ اتنے پرانے زمانے کی اُردو اتنی اچھی ہوگی تو بعض لوگ زمانہ بناتے ہیں۔ زمانہ ان کو نہیں بناتا۔ میرؔ ان شاعروں میں سے تھے جن کو زمانے نے نہیں بنایا۔ انہوں نے زمانہ بنایا۔ اردو کے اوپر اپنی ایک چھاپ ڈالی ہے اور وہ پھر کبھی نہیں مٹ سکتی۔ جو مرضی آجائے جتنے چوٹی کے شاعر آجائیں مگر میر تقی میرؔ نہیں بن سکتا۔ ذوقؔ کہتا ہے

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

چوٹی کے شعراء نے بڑا زور مارا ہے کہ میرؔ بن سکیں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میر کی باتیں ہی الگ اس کے چٹکلے ہی الگ۔ ہر مصرعہ عجیب طرح سے بولتا ہوا زندہ ہے۔“

(الفضل 2 نومبر 1998ء)

میرؔ خود ایک جگہ کہتے ہیں

گئی عمر در بندِ فکرِ غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے

غالبؔ نے میرؔ کی عظمت کا اعتراف کچھ یوں کیا ہے۔

ریختہ کے تم ہی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور

غالبؔ اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

حسرت موہانی نے کچھ یوں کہا ہے کہ

شعر اپنا بھی بہت خوب و لیکن حسرت
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ میرؔ کو اردو شاعری میں کس قدر بلند مقام حاصل ہے۔ میرؔ کو خود بھی اپنے اعلیٰ و منفرد انداز کا پوری طرح احساس تھا وہ خود کہتے ہیں۔

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدّت رہیں گی یاد یہ باتاں ہماریاں

دوسری جگہ کہا

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

(الفضل 15 تا 21 اگست 2003ء)

داد داوری

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے صاحبِ طرز استاد شعراء کو ان کے کمال فنّ کی داد بھی دی ہے اور ان کی شاعری کی پنہائیوں میں اتر کر اس کی اصلیّت کو نکھار کر بھی پیش کیا ہے۔ جب آپؒ نے ان کی تخلیق کی خوبیاں بیان کی ہیں تو اس بیان میں ایک ذرّہ برابر کمی نہیں کی۔ آپؒ نے دل کھول کر ان کے کلام کا حسن پیش فرمایا ہے۔ جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں دیکھا کہ کسی شعر کے کمال فہم و ادراک کی تو بات ہی کچھ اور ہے مگر نقد و نظر میں جو رفعت و وسعتِ نظری ہے وہ بھی آپؒ کے بیان میں غیر معمولی حسن و توازن کے ہمراہ رنگ بکھیرتی ہے۔

جہاں تک عصرِ جدید کے شعراء کا تعلق ہے، آپؒ فیض احمد فیضؔ کو بہت پسند فرماتے تھے اور تحسین و داد کے ساتھ ان کے اشعار کو اپنی گفتگو اور اپنے خطابات میں بھی زینت عطا کرتے تھے۔ اسی طرح حبیب جالبؔ کی بھی آپؒ نے خوب پذیرائی فرمائی۔ 1985ء میں آپؒ کی پسند کے باعث ان کی نظموں کی کیسٹس جماعت میں کثرت سے سنی گئیں۔

23؍مارچ 1981ء کا ذکر ہے کہ آپؒ نے اس روز جمعہ کِرتَو ضلع شیخوپورہ میں پڑھایا اور وہاں مجلس سوال و جواب بھی منعقد کی۔ وہاں سے واپسی کے سفر کے ذکر میں آپؒ فیضؔ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"کِرتَو میں... فیض احمد فیضؔ یاد آیا کیونکہ یہ اس کا گاؤں ہے۔ کِرتو نے بھی خوب شاعر پیدا کیا ہے۔ حدّ ہی کر دی ہے۔ واپسی پر چوہدری انور حسین صاحب بھی ساتھ تھے اور غلام سرور صاحب بھی تھے۔ جن کی آواز بڑی سریلی اور پُرسوز ہے۔ فیضؔ کی یاد میں انہیں فیضؔ کی نظمیں سنانے کے لئے کہا تو پتہ چلا کہ صرف تین شعر یاد ہیں۔ کِرتو سے شیخوپورہ تک سارا رستہ یہی تین شعر سنتے رہے اور پھر بھی دل نہ اکتایا مسلسل سر دھنتے رہے۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے
جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

پھر آپؒ ایک مرتبہ لندن سے اسلام آباد کے مختصر سے سفر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”راستے میں نظموں کی ایک ٹیپ لگائی تو پتہ چلا کہ غلام سرور صاحب شیخوپورہ نے میری فرمائش پر فیض مرحوم کی بعض غزلیں ریکارڈ کرواکر بھجوائیں تھیں۔ غزلوں کا انتخاب میں نے خود کیا تھا۔ کچھ تو اس لئے چنی تھیں کہ پاکستان کے حالات پر چسپاں تھیں اور میرے مظلوم احمدیوں کی یاد تازہ کرتی تھیں۔ بعض تو ایسی ہیں کہ لگتا ہے جیسے فیض نے ہمیں موضوعِ سخن بنایا ہو۔“

یہ تو داد داوری کا قصّہ تھا۔ اس کے برعکس ایک اور پہلو بھی نظر انداز نہ ہو جائے کہ کسی کے شعر ہوں یا سنانے والے کا خراشدار ترنّم، آپؒ اسے کسی حدّ تک برداشت تو سکتے تھے مگر اس پر تبصرہ کرنے میں سچائی کو نہ صرف یہ کہ چھپا نہیں سکتے تھے بلکہ اس کے برملا اظہار میں کسی قسم کا حجاب یا تکلّف بھی نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ جون 1981ء میں سیالکوٹ میں رائے پور تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”شام کو اچانک موسم بدل کر سخت مزیدار ہوا چلنے لگی تھی اور بادل آ گئے تھے۔ لہٰذا واپسی پر شرکاء کا مزاج شعر و ادب کی طرف مائل ہو گیا اور ایک صاحب کے متعلق پہلے تو یہ بتایا گیا کہ ہیر بہت اچھی پڑھتے ہیں اور پھر یہ غالب اور دیگر اساتذہ کا کلام بھی۔ میں قسمت کا مارا شعر و ادب کا متوالا ان چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا اور نظم خوانی کی اجازت دے بیٹھا۔

ہیر تو خیر جتنی پڑھی اچھی آواز میں پڑھی اور ہیر کے مضمون میں کافی مناسبت تھی۔ لیکن بعد از ہیر جو کارروائی ہوئی اس نے میرے اعصاب کے پرخچے اڑا دیئے۔ پہلے بہادر شاہ ظفر معزول شدہ جلاوطن مظلوم بادشاہ کی شامت آئی اور ہیر کی طرز پر اس کی غزلوں کا جنازہ خراب کیا گیا۔ پھر

جو شامت آئی میرے محبوب شاعر غالبؔ کی تو میں بتا نہیں سکتا جو میرے دل کی کیفیت تھی۔ اعصاب کھینچ کر تنا تن ٹوٹنے لگے اور ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے اور اعصاب کی کرچیوں نے چبھ چبھ کر تن بدن میں آگ لگا دی۔"

حضرت صاحبزادہ صاحبؒ دیگر شعراء کا کلام پڑھ کر اس کی اصلاح بھی تجویز فرماتے اور اگر کسی جگہ لفظ، مطلب و مضمون میں اونچائی کی گنجائش ہوتی تو برملا تجویز فرما دیتے۔ اس سے لکھنے والا اس التفات و عنایتِ خسروی پر ناز کرتا تھا۔ گو آپؒ کی عطا فراخی داماں کا مطالبہ کرتی تھی مگر یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ جس کے کلام کو وقت کا مقدّس خلیفہ خود آب دیتا ہے، اس میں ایک گوناں چمک اور نکھار کا پیدا ہو جانا قدرتی امر ہے۔



عبید اللہ علیمؔ صاحب کی شاعری کو آپؒ نے پذیرائی، برکت اور شہرت عطا کی۔ ان کے کلام کا ایک خاص مقام ہے اور فن میں ایک خاص پَن۔ اسے آپؒ کی نظرِ رسا نے دیکھا اور پھر اسے جماعت میں شہرت کے افلاک تک پہنچا دیا۔ کراچی اور لندن میں اپنے ساتھ بٹھا کر ان کی شاعری سنی اور برطانیہ اور یورپ کے کئی ممالک میں مشاعرے کروائے۔

آپؒ مکرّم پروفیسر چوہدری محمد علی صاحب مضطرؔ کی شاعری کو بے حد سراہتے تھے۔ محمود ہال میں خود پاس بیٹھ کر آپ کے اعزاز میں مشاعرہ کروایا اور داد سے نوازا۔ اپنی اردو کلاس میں بھی آپ کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش فرمایا۔ چوہدری صاحب مرحوم کی شاعری پر آپؒ نے انہیں جو خط لکھے، ان میں سے چند اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

"آپ کی کس کس غزل پر کیسے اپنے ہاتھ سے لکھ لکھ کر داد دوں۔ میں تو قلم توڑے بیٹھا ہوں۔

محبت ہو گئی ہے تجھ سے مضطر!
تو کس محبوب کا نوکر رہا ہے

پھر ایک نظم پر تحریر فرمایا: "بہت اعلیٰ پائے کی سہل ممتنع نظم ہے۔ آپ کا اپنا ہی الگ رنگ ہے جو کسی اور کو اپنانے کی توفیق نہیں ملی کیونکہ یہ رنگ آپ کے مزاج کا رنگ ہے اور عموماً ایک زمانے میں ایک سے زیادہ محمد علی پیدا نہیں ہوا کرتے۔ چشمِ بدور۔"

ایک دفعہ لکھا: "آپ کی ہر غزل پر اگر ایک الگ خط لکھوں تب بھی حق ادا نہیں ہو سکے گا۔ پتہ ہے مجھے آپ کا کلام کیوں پسند ہے۔ شعراء کے کلام سے الگ اس میں ایک اپنی سی دلکشی ہے۔ سر دست امتیازی جاذبیت کی صرف تین باتیں بتا دیتا ہوں۔......

کھری کھری سنانی اور پتھر مارنے والوں پر پتھر مارنے تو بہتوں کو آتے ہیں مگر شعر و ادب کی پنکھڑیوں میں لپیٹ کر پتھر مارنے کوئی آپ سے سیکھے۔ پھر لطف یہ کہ پتھراؤ کا مزا بھی آتا ہے اور پنکھڑیوں کی نزاکت اور لطافت بھی مجروح ہوئے بغیر اپنے دلکش رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ آپ سر اپنا پتھروں کے حضور پیش کرتے ہیں اور پتھراؤ مارنے والوں کے سروں پر۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

سادہ لفظوں میں سرِ راہے بظاہر یونہی عام سی بات کر جاتے ہیں لیکن ایک دو قدم آگے بڑھ کر پھر مڑنا پڑتا ہے۔ ایک خلش سی پیدا ہوتی ہے کہ کوئی بات تھی جو نظر سے رہ گئی ہے۔ بات بھی

پھر ایسی گہری اور پُر حکمت نکلتی ہے کہ دو قدم چھوڑ ہزاروں قدم واپس آکر بھی حاصل ہو تو جوازِ سفر سے بڑھ کر نکلے۔

تیسری خاص بات یہ دیکھی ہے کہ مجال ہے جو کسی بھیڑ میں مل جل کر اپنی شخصیت گنوا بیٹھے ہوں۔ شاہوں میں فقیرانہ گدڑی میں اور فقیروں میں شاہانہ لباس اوڑھے پھرتے ہیں۔ کوئی دور ہی سے دیکھ کر کہے کہ وہ دیکھو محمد علی کس سج دھج سے جارہا ہے۔"

اسی طرح لکھا: "آپ کی ہر نظم ہی ماشاء اللہ آسمانِ شعر پر ایک اور روشن ستارہ طلوع کرتی ہے مگر بعض ستارے دوسروں سے روشن تر ہوتے ہیں۔ سادگی کے ساتھ پُرکاری کا لفظ تو آپ پر سجتا نہیں۔ کیونکہ پُرکاری میں کچھ فریب کے معنی پائے جاتے ہیں جبکہ نہ آپ کو پُرکاری آتی ہے نہ اداکاری ہاں جانکاری ضرور آپ کی نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔"

اسی طرح متعدد خطوط میں حضورؒ نے چوہدری صاحب مرحوم کو ان کی شاعری پر خراجِ تحسین پیش کئے جو ان کے مجموعہ کلام "اشکوں کے چراغ" کے شروع میں درج ہیں۔

دیگر قادرالکلام شعرائے کرام بھی بکثرت آپؒ کو اپنا کلام دکھاتے۔ آپؒ داد دیتے تو سچّی، سُچی، اُچّی اور دل کھول کر۔ بعض دفعہ بڑے شاعر نوآموز شاعروں کی تک بندیوں کی حوصلہ افزائی تک نہیں کرتے۔ مگر آپؒ کا دل بہت بڑا ہے۔ آپؒ شاعر نواز بھی ہیں اور شاعر گر بھی۔ آپؒ کے لطف و کرم کی بارشیں شعراء کو تشکّر اور سرشاری عطا کرتی ہیں۔ آپؒ ان کے کلام کی اصلاح کے ساتھ ان کی حوصلہ افزائی بھی فرماتے ہیں اور انہیں دعائیں بھی دیتے ہیں۔ مختلف شعراء کو آپؒ کے عطا کردہ چند تبصرے ملاحظہ فرمائیں:

محترمہ امۃ الباری ناصر صاحبہ کی نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ساری نظم ہی بڑی پراثر ہے اور فصیح و بلیغ ہے مگر بعض اشعار اور بعض مصرعے تو شوخیٔ تحریر کے فریادی بنے ہوئے ہیں.... ماشاء اللہ بہت عمدہ نظم ہے اور یہ شعر تو خاص طور پر لائق تحسین ہے کہ

جِلو میں لاتا ہے سیلاب رحمت
ذرا سا عکس آنکھوں میں نمی کا

یہ شعر خصوصاً اس لئے عین دل کے نشانے پر لگا کہ ایک ہی دن پہلے مَیں یہ مضمون سوچ رہا تھا کہ اللہ کی لا انتہا رحمت کی کیا شان ہے کہ ہماری آنکھوں کی نمی پر ہی رحمتوں کی بارش برسا دیتا ہے۔“

ایک اور نظم کو زیورِ تحسین سے آراستہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”بعض اشعار تو یوں اٹھتے اور بلند ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ نگاہوں کے قدم روک لیتے ہیں۔ زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں سرسری نظر سے دیکھ کر اپنی قدر شناسی کو پامال کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ احمدی شعراء کو اللہ تعالیٰ نے سچائی کی تاجوری بخشی ہے اور سچائی ہی ان کے کلام کو ایک امتیازی حسن بخشتی ہے۔ آپ کا کلام بھی اس منبع حُسن سے بہرہ ور ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے کلام میں کچھ خوبیاں ہیں جو اسے انفرادی رفعت عطا کرتی ہیں۔ قافیہ کے استعمال میں اچانک ایسا تنوّع جو یکسانیت کو اس طرح توڑتا ہے کہ موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بھی بہت سے اشعار دل پر براہِ راست بے ساختہ اثر کرتے ہیں۔ یہ تو کوئی صاحبِ فن ہی آپ کو بتا سکتا ہے کہ صنعتی اعتبار سے اُن میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ مجھے تو صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ زبان سبک رَو ہوتی ہے اور مضمون دلنشین۔ جیسے

وہاں شاید کسی کا دل دکھا تھا
زمیں تپتی رہی۔ بادل نہ ٹھہرا

لاکھوں میں ایک شعر ہے۔ لچک بھی ایسی ہے کہ صاحبِ دل کے بدلنے سے اس کا دوسرا مصرعہ بآسانی ایک دوسرے رنگ میں ڈھل سکتا ہے۔ مثلاً مَیں ہوتا تو یوں کہتا

وہاں شاید کسی کا دل دُکھا تھا
فضا برسی اگر بادل نہ ٹھہرا

پھر اسی غزل کا یہ شعر ہے۔

گرا تو کیسی پستی میں گرا ہے
حجاب اُترا تو پھر آنچل نہ ٹھہرا

ایک ایسی احمدی شاعرہ کے منہ سے کیسا سجتا ہے جس نے قیامِ حجاب کی راہ میں سالہا سال جانکاہی کی ہو۔ چہرہ اس شعر کا بتا رہا ہے کہ یہ نہ تو کسی زاہدِ خشک کا کلام ہے نہ کسی بے عمل شاعر کا بلکہ ایک باریک نظر صاحب تجربہ کے دل کی پکار ہے۔ دوسرا مصرعہ تو لاجواب ہے:

حجاب اُترا تو پھر آنچل نہ ٹھہرا

"بعض جگہ معمولی سی ترامیم تجویز کی ہیں۔ آپ کا کلام ماشاء اللہ بلند پایہ ہے تاہم کبھی کبھی معمولی کتر بیونت عادتاً کر دیتا ہوں۔ صرف آپ ہی کا کلام اس مشقِ ستم کا نشانہ نہیں بنتا۔ چوہدری محمد علی صاحب۔ سلیم شاہجہانپوری صاحب، نسیم سیفی صاحب، جنرل محمود الحسن صاحب، عبد المنان ناہید صاحب، عبد الکریم قدسی صاحب، عزیزہ قوسی (صاحبزادی امۃ القدوس صاحبہ)، حبیب ساحر وغیرہم جو ماشاء اللہ شعر و شاعری میں اپنا اپنا مقام بنا چکے ہیں بلکہ بعض تو اساتذہ فن کے ہم پلّہ اور صاحبِ طرز ہیں۔ ان کے کلام سے بھی جہاں محظوظ ہوتا ہوں وہاں کبھی کسی شعر کو اپنے مزاج اور ذوق میں ڈھالنے میں بھی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ غالباً یہ دست درازی اصلاح کی قبیل میں شمار نہیں ہوتی۔ اسے کسی اچھی چیز کو اپنانے کی سعی کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ آپ کی یہ زیرِ نظر نظم الفضل میں دیکھی تو مندرجہ ذیل اشعار میں کہیں کہیں اپنے ذوق کے مطابق تبدیلی کی ہے جو ضروری نہیں کہ جو کچھ آپ کہنا چاہتی ہیں اس کے مطابق ہو یا اس سے بہتر ہو۔"

ذرا آقا کا پُر صداقت گوشہ دل تو دیکھئے! غلامانِ جماعتِ احمدیہ کی ہر نوع کی اصلاح کی ذمہ داری اور اس کی درستگی کے جملہ حقوق کی الٰہی سند رکھتے ہوئے بھی "کسی اچھی چیز کو اپنانے کی سعی کہنا زیادہ موزوں ہو گا" اور "اس کے مطابق ہو یا اس سے بہتر ہو" کے الفاظ آپؒ کے عجز و انکسار سے لبریز دل کے فطرتی اظہار کے آئینہ دار ہیں۔ آپؒ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ

شاعر کا دل بھی ایک شیشے کی مانند ہوتا ہے جو اپنے شعر پر ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا۔ مگر یہ عرفان بھی تھا کہ آپؒ کی طرف سے لگی ہوئی ٹھکوراس کے شعر کے حسن کو صرف سنوارتی نکھارتی ہی نہیں پُر حقیقت و پُر شوکت بھی بناتی ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی کے اشعار پر آپؒ کی لگی ہوئی 'ضربیں' ان کے لئے باعثِ صد سعادت وافتخار ہوتی ہیں۔ پھر آپؒ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

"الفضل میں طبع ہونے والے احمدی شعراء کے کلام سے وقت ملے تو اپنائیت کے رنگ میں کبھی ایک آدھ شعر پر مشقِ ستم کرلیتاہوں۔ اس طرح ذہن کو چند منٹ سستانے کا موقع مل جاتا ہے۔"

ایک مرتبہ محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ منیر صاحبہ کے ایک ہندی لَے میں لکھے ہوئے گیت کو بہت پسند فرمایا اور خوب داد دی۔ اسی طرح ایک اور تخلیق پر انہیں خراجِ تحسین پیش فرماتے ہوئے لکھا:

"آنسوؤں کی لڑی میں پروئے ہوئے آپ کے دو خلوص کے پھولوں کے ہار ملے۔ اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو بعض دفعہ ایک آنسو کی اتنی قیمت پڑ جاتی ہے کہ انسان کی ساری زندگی اور اس کے ماحصل سے بڑھ کر وہ آنسو قدر کے لائق ہو جاتا ہے۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء

نظمیں پڑھتے ہوئے حیرت اور تعجّب سے میں یہ سوچتا رہا کہ علم و ادب کا یہ جوہر آپ نے آج تک کیسے چھپائے رکھا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آپ ماشاء اللہ اتنا اعلیٰ پائے کا ادبی ذوق رکھتی ہیں۔ اَللّٰھم زد فزد۔"

(خط 1982-1-7/1361ھش)

حتمی مہر

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ شعر و سخن میں اپنی حتمی مہر رکھتے تھے۔ جو کسی کلام کے معیار، اس کی تصحیح و تغلیط اور حسن و قبح پر قطعی حکم رکھتی تھی اور آپؒ کا فیصلہ آخری حیثیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایک بار آپؒ کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا کہ

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیئے اپنی جبیں سے

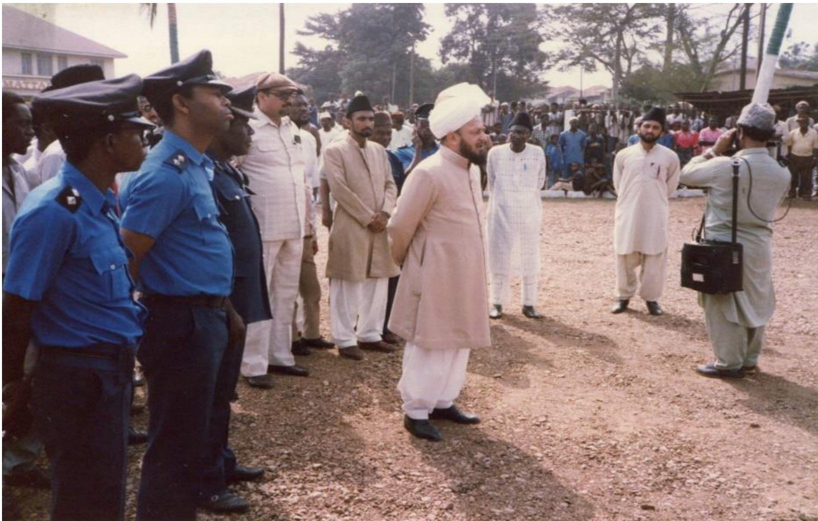
آپؒ نے بلاتوقف فرمایا: ”نہیں۔“ نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے۔ چونکہ دوسرے مصرعے میں ”پونچھیئے ہے“ اس لئے یہاں لفظ ”آپ“ آئے گا۔ عرض کیا گیا کہ لکھنؤ کے لوگ دُوری اور تکلّف کو ختم کرنے کے لئے ”تم“ کہتے ہیں اور ادب کو ملحوظ رکھنے کے لئے ”پونچھیئے“ بولتے ہیں۔ اس پر آپؒ نے فرمایا۔ نہیں! یہ غلط ہے۔ ٹھیک ”آپ“ ہی ہے۔

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 14/ اپریل 2022ء)

ایک شہرہ آفاق صداقت انفاس خطیب
حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ
قسط اول

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمدؒ نے سترہ، اٹھارہ سال کی عمر میں تقاریر کے میدان میں قدم رکھا اور شروع ہی میں سننے والوں کو یہ احساس دلا دیا کہ آپؒ اِس صلاحیت کے اعتبار سے بھی ایک امتیازی شان کے حامل ہوں گے۔ چنانچہ قادیان میں بھی اور اسلامیہ کالج لاہور کے انعامی تقریری مقابلہ میں بھی آپؒ کی تقریر سننے والے جانتے تھے کہ آپؒ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس میدان کے بھی زبردست شہسوار تھے۔



آپؒ کی یہ صلاحیت وقت کے ساتھ ساتھ ترقی بھی کرتی گئی اور صیقل بھی ہوتی گئی۔ جامعہ احمدیہ سے تحصیل علم کے بعد جب آپؒ لندن گئے تو وہاں بھی دوران تعلیم اپنے ہم مکتب طلبہ، پروفیسروں اور دیگر علمی حلقوں میں اسلام کی حقانیت اور اس کی تعلیمات کو اعلیٰ اور بالا ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ مسجد فضل لندن میں اپنے پروفیسروں اور طلبہ کو مدعو کر کے انہیں بھی اسلام کے بارہ میں لیکچر دیتے، ان کے ساتھ تبلیغی گفتگو کرتے اور انہیں جماعت کی کتب پیش کرتے۔ اسی طرح بعض اوقات مسجد دیکھنے اور اسلام کے بارے میں معلومات کے حصول کے لئے جو لوگ آتے، آپؒ انہیں بھی لیکچرز اور سوال وجواب کے ذریعہ اسلام کی حسین تعلیم سے روشناس کراتے۔

لندن سے واپسی کے بعد آپؒ خدمات سلسلہ کے میدان میں مختلف مواقع پر تقاریر وغیرہ کرتے رہے۔ البتہ جماعت کے ایک مقرر کے طور پر آپؒ نے جلسہ سالانہ ربوہ 1960ء میں پہلی بار خطاب فرمایا جس کا عنوان تھا ''تحریکِ وقفِ جدید کی اہمیت''۔ اس پُر اثر خطاب کے بعد خلافت ثانیہ کے عہد میں جلسہ سالانہ کے موقع پر آپؒ نے مسلسل تین سال اور خلافتِ ثالثہ کے عہد مبارک میں آپؒ نے جلسہ سالانہ ربوہ کے سٹیج پر 15 سال نہایت بصیرت افروز تقاریر کیں۔ ان کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

1. حضرت نبی کریمؐ کی قوّت قدسیہ 1966ء
2. احمدیت نے دنیا کو کیا دیا 1967ء
3. فلسفۂ دعا 1968ء
4. اسلام اور سوشلزم 1969ء
5. حضرت مصلح موعودؓ کی خدمتِ قرآن 1970ء
6. حقیقت نماز 1972ء
7. اسلام کی نشاۃ ثانیہ خلیفۃ الرّسول سے وابستہ ہے۔ 1973ء

8. اسلام کا بطلِ جلیل 1974ء
9. اشاعتِ اسلام کے لئے جماعت احمدیہ کی جانفشانی 1975
10. قیام نماز 1976ء
11. فلسفۂ حج 1977ء
12. فضائل قرآنِ کریم 1978ء
13. غزوات میں آنحضرتؐ کا خُلقِ عظیم (غزوۂ احد) 1979ء
14. غزوات میں آنحضرتؐ کا خلقِ عظیم (غزوۂ خندق) 1980ء
15. غزوات میں آنحضرتؐ کا خُلقِ عظیم (غزوۂ حدیبیہ) 1981ء

ان کے علاوہ مجلس خدّام الاحمدیہ اور مجلس انصار اللہ کے مرکزی، ضلعی اور مقامی اجتماعات و جملہ تقریبات میں سینکڑوں خطاب کئے جو علم ورُشد سے معمور ہوتے تھے اور مجالس کے لیے ترقی و کامیابی کے حصول کا موجب بنتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیحؒ کے لئے اپنے مخصوص فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے جماعتوں میں جانا ممکن نہیں تھا۔ لیکن آپؒ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک خلیفۃ المسیح کی آواز بن کر مسلسل سفر کرتے تھے اور ان کی تعلیم اور منشاء جماعتوں میں پہنچاتے تھے۔

ایک مقرّر اور خطیب

اسلامی روایات کے مطابق جماعت احمدیہ کے ہر امام کی طرح آپؒ کا ہر خطبہ و خطاب تشہّد، تعوّذ اور سورۃ الفاتحہ کے ساتھ کسی آیتِ قرآنیہ سے شروع ہوتا تھا اور درمیان میں حسب موقع و ضرورت احادیث رسول اور اقتباسات حضرت مسیحِ موعودؑ شامل ہوتے تھے جو آپؒ کے بیان کی زینت و شان بھی تھے اور مرکزی خیال بھی۔ زیر بحث موضوع پر آپؒ کا تجزیہ بیحد مکمل، معیّن اور جامع ہوتا تھا اور اس کے پس منظر اور پیش منظر پر پوری نظر ہوتی تھی۔ حسب روایات آپؒ کا ہر خطاب دعائیہ کلمات کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا تھا۔

آپؒ کی خطابت میں ایک کامل مقرّر اور خطیب کی جملہ صفات وجوہر بڑے توازن کے ساتھ اجاگر تھے۔ اس میں موقع و محل پر لطائف و مزاح کے نگینے بھی مرصّع ہوتے تھے، رقّت و لطافت بھی اور دلگداز پہلو بھی۔ عین وقت پر جوش و جلال بھی اپنی جولانی دکھاتا تھا اور بروقت انذار و تبشیر کی تجلّیات بھی جلوہ گر ہوتی تھیں۔ آپؒ کا خطاب برجستہ مگر برموقع اشعار سے بھی مزیّن ہوتا تھا اور واقعات، امثلہ، ضرب الامثال، برموقع لطائف اور پُر حکمت اشعار سے بھی پُر رونق ہوتا تھا۔ وہ دلائل و منطق کے زیور سے آراستہ بھی ہوتا تھا اور تحدّیات سے رنگین اور زورآور بھی۔ آپؒ کے خطبے و خطابات کسی بھی ماہر فنّ مقرر کی جملہ خوبیاں تو اپنے اندر رکھتے تھے مگر ان کا اصل گہنا اور تابش وہ سچائی تھی جو دلوں کے پاتال میں جاگزین ہو کر جسم و روح پر ایک گہری تاثیر مرتب کر دیتی تھی۔ آپؒ کا پیغام سچائی تھا اور آپؒ کے خطبوں اور خطابات کا عنوان بھی سچائی تھا۔ لہٰذا اس کا اثر حتمی بھی تھا، ممتاز بھی اور امر بھی۔ چنانچہ خطاب کا مرکزی نکتہ و پیغام کسی لمحہ بھی سامع سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔

الغرض آپؒ کے خطبے و خطاب کی اصل تاثیر وہ سچا پیغام تھا جو قرآنِ کریم، سنّت و حدیث رسول، فرمودات حضرت مسیح موعودؑ کے سوتوں سے پھوٹتے مصفّٰی پانی سے غسل یافتہ تھا۔ چنانچہ آپؒ کی یہ آوازِ حق اپنی تاثیر کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے لے کر دنیا کی یونیورسٹیوں، دانشوروں کے مرکزوں اور چوٹی کے علمی اداروں میں گونجتی رہی۔ آپؒ کے خطابات ان پڑھ شخص سے لے کر تعلیم کی انتہائی چوٹیوں پر جاگزیں دانشوروں تک، سب کو یکساں فیضیاب کرتے تھے۔

حضورؒ کے قابل قدر لیکچرز

1983ء میں آپؒ نے آسٹریلیا کی The University of Canberra کی دعوت پر بعنوان Some Distinctive Features of Islam پر لیکچر دیا اور یونیورسٹی کے پروفیسرز اور طلبہ کو اسلام کی ممتاز خوبیوں سے روشناس کرایا۔

1985ء میں آپؒ نے دنیا کی شہرہ آفاق کیمبرج یونیورسٹی یوکے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، زندگی، ہجرت اور وفات پر ایک جامع مانع لیکچر دیا اور سامعین کے سوالات کے جواب بھی دیئے۔ جس کا کچھ تذکرہ شروع میں گزر چکا ہے۔

حکومت پاکستان نے اپنے ظالمانہ قوانین کا جواز قائم کرنے کے لئے جماعت احمدیہ کے خلاف ''قادیانیت، اسلام کے لئے سنگین خطرہ'' کے نام پر قرطاس ابیض شائع کیا تھا۔ حضورؒ نے ان بے بنیاد الزامات کا جواب خطبات جمعہ کے ذریعہ 25جنوری 1985ء سے شروع کیا جو 13 مئی 1985ء تک جاری رہا۔ یہ خطبات اب ''زَھَقَ البَاطِل'' کے نام سے اردو اور عربی میں کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں جو جماعت کے علم کلام میں انتہائی اہم اور بلند حیثیت کے حامل ہیں۔

سن 1987ء میں حضورؒ نے Revelation, Rationality, Knowledge and Truth کے موضوع پر زیورخ یونیورسٹی سوئزرلینڈ میں ایک معرکہ آراء لیکچر دیا۔ بعد میں آپؒ نے اسی لیکچر کو تفصیل دے کر اسی نام سے ایک عظیم الشان کتاب کی شکل دی اور اسے 1998ء میں ساری دنیا میں شائع کیا گیا۔ اس کے اردو اور عربی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب دنیا بھر کے دانشوروں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ آپؒ نے فرمایا کہ ''یہ میری تمام زندگی کے تجربوں اور علوم کا نچوڑ ہے۔'' اسی طرح آپؒ نے اپنی اس کتاب کے بارہ میں یہ اظہار بھی فرمایا ''یہ کتاب آئندہ سو سال کی علمی ضرورتیں پوری کرتی رہے گی۔ ہر قسم کے مسئلوں کا حل اس میں آ گیا ہے۔'' آپؒ اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ لیکچر 14 جون 1987ء کو جمعرات کی شام سوا آٹھ بجے یونیورسٹی آف زیورخ کے آڈیٹوریم میں ہوا۔ اس وقت تمام آڈیٹوریم اس قدر بھرا ہوا تھا کہ انتظامیہ کو ایک اور آڈیٹوریم کا بھی انتظام کرنا پڑا جہاں پر یہ لیکچر بذریعہ ٹیلیویژن اور لاؤڈ سپیکر سنا گیا...... یہ وہی آڈیٹوریم ہے جہاں

9 ستمبر 1946ء کو سرِ ونسٹن چرچل (Sir Winston Churchill) نے وہ یادگار خطاب دیا تھا جس کا عنوان Let Europe Arise تھا اور یہی لیکچر European Common Market کے وجود کا باعث بنا۔"

جب حضورؒ نے سوئزرلینڈ کی یونیورسٹی آف زیورخ میں یہ خطاب فرمایا تو آڈیٹوریم لبالب بھرا ہوا تھا بلکہ بہت سے لوگ کھڑے بھی تھے۔ اندازہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار سے زائد افراد تھے جن میں سے ہزار / بارہ سو مقامی سوئس لوگ تھے۔ خاکسار خود بھی وہاں موجود تھا۔ چنانچہ وہاں کے منتظمین کا کہنا تھا کہ اس آڈیٹوریم کی تاریخ میں صرف دو دفعہ کسی لیکچر میں اتنے لوگوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ یعنی ایک دفعہ جب چرچل نے وہاں آکر لیکچر دیا تھا اور دوسری بار یہ تھی جب حضورؒ نے خطاب فرمایا ہے۔

بعد ازاں کتابی شکل میں کتاب Revelation ,Rationality, Knowledge and Truth کے نام سے شائع ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر جناب ٹام کاکس لکھتے ہیں:

"آج میں حضرت مرزا طاہر احمد صاحب کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جو کہ کتاب Revelation, Rationality, Knowledge and Truth کے مصنف ہیں۔ آپ ایک ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک شخصیت ہیں اور مختلف النوع علوم کے ماہر ہیں۔ آپ ایک حاذق طبیب ہیں اور سائنسی علوم سے بہرہ ور ہیں۔ آپ ایک جید فلاسفر اور منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ دراصل آپ گیارھویں اور بارھویں صدی میں گزرنے والے ابن سینا اور ابن رشد کی طرح علم کا ایک بے پناہ خزانہ ہیں۔ اور انواع و اقسام کے مضامین اور علم کے مختلف شاخوں پر خوب دسترس رکھتے ہیں۔ اس نہایت وسیع اور گہرے علم کے ساتھ ساتھ جو مختلف جہتوں سے آپ کو حاصل ہے۔ آپ اسلام کی تعلیمات کی حکمت اور عظمت کو سمجھنے میں دیگر تمام دنیا سے بلند ایک

ممتاز مقام پر فائز ہیں۔ حقیقت کے منکر اور دہریوں کے خلاف آپ کے دلائل قاطع ہیں۔ اور ایسے ہیں کہ انہیں ان کے ناقابل فہم اور بعید از عقل خیالات کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت قرآن کا وہ گہرا اور عظیم علم ہے جو آپ کسی نظریئے کی تائید یا حق میں پیش فرماتے ہیں۔ دراصل مذہبی صحائف کا علم محض ذاتی مطالعے کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسا تحفۂ خداوندی ہے جو صرف چند لوگوں کے ہی حصے میں آتا ہے۔ دراصل یہ تحفۂ خداوندی الہام ہی ہے اور میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ چند ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جو الہام کی نعمت سے حصہ پاتے ہیں۔ وہ چند خوش نصیب جنہیں خدا تعالیٰ اپنی جناب سے اس نعمت عظمیٰ کے لئے چن لیتا ہے۔ میں نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی دنیا کے علم وفضل سے بہرہ ور لوگوں کے سردار ہیں۔ اور میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔“

(نوٹ: یہ تبصرہ جلسہ سالانہ برطانیہ 1998ء کے موقع پر جناب ٹام کاکس ممبر پارلیمنٹ ٹوٹنگ نے پیش کیا)

16 جون 1989ء کو Hotel Harbor Castle Westin ٹورانٹو کینیڈا میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی کتاب ”مذہب کے نام پر خون“ کے انگریزی میں ترجمہ Murder in the Name of Allah کی تقریب رونمائی منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں کینیڈا کی تینوں بڑی سیاسی جماعتوں کے سرکردہ اراکین، کینیڈا کے وزیر خارجہ عزت مآب Joe Clark کے خصوصی نمائندہ، قومی لبرل پارٹی کے کئی ممبر پارلیمنٹ، نیو ڈیموکریٹک پارٹی کے لیڈر Bob Rae اور چار شہروں کے میئرز نیز شہر کے مختلف طبقات کے نمائندے، دانشور، تاجر، وکلاء، جرنلسٹ وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ اس تاریخی تقریب میں کم وبیش پانچ سو غیر از جماعت دوست تھے۔ حضورؒ نے اس بھرپور تقریب میں ”اسلام اور امن عالم“ کے موضوع پر خطاب فرمایا اور بعد میں سوالات کے جوابات دیئے۔

آپؒ نے 15 اکتوبر 1989ء کو Heathland School Hounslow UK میں بر موضوع The Seal of Prophets, His Personality and Character کے عنوان

سے لیکچر دیا جس میں لندن کے احبابِ جماعت کے علاوہ علاقہ کے دانشور، سیاستدان اور مذہبی لیڈر بھی موجود تھے۔اس میں آپؒ نے آنحضرتؐ کو مختلف مستشرقین کی طرف سے دیئے گئے خراجِ تحسین کی روشنی میں آپؐ کی حسین سیرت اور آپؐ کی مہرِ نبوّت کی تاثیرات کے متعدد پہلوؤں کو اجاگر فرمایا۔

24فروری 1990ء کو The Queen Elizbeth II conference Centre London میں آپؒ نے Islam's Response to Contemporary Issues یعنی "اسلام اور عصرِ حاضر کے مسائل کا حل" کے عنوان پر لیکچر دیا۔ اس موقع پر برطانیہ کے آٹھ صد سے زائد سیاستدان، صحافی، مفکّر، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مختلف علوم کے پروفیسر صاحبان، مذہبی علوم کے ماہرین، عربی دان اور دانشور اکابرین موجود تھے۔اس لیکچر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آپؒ کے بیان فرمودہ اسلامی نقطہ نظر کو خراج تحسین دیئے بغیر رہا ہو۔

بعد میں یہ لیکچر کتابی شکل میں شائع ہوا۔اس وقت سے اب تک محققین اور متلاشیانِ حق کے لئے مستقل طور پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے سچی اور تسکین افزاء معلومات مہیّا کرنے کا رہنما سرچشمہ ہے۔یہ کتاب مسلسل ہر درجہ علم کے قاری سے خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔

1989ء میں Sydney آسٹریلیا The Philosophy of Revival of Religion کے موضوع پر انتہائی جامع لیکچر دیا اور سامعین کے سوالات کے جواب دیئے۔

اسی سال 12مارچ 1990ء کو آپ نے Sville University of Spain کی دعوت پر بر موضوع Islam, A Discourse on the Elementary and Fundamental Teaching وہاں کے طلبہ اور پروفیسروں کو خطاب فرمایا اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کی حکمت و فلاسفی پر جامع رنگ میں روشنی ڈالی۔

1990ء میں آپؒ نے سورۃ فاتحہ کی روشنی میں نماز کے قیام اور اس میں لذّت و جذب پیدا کرنے کے لئے خطبات کا طویل سلسلہ شروع کیا۔ جو ''ذوق عبادت اور آداب دعا'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

3جون 1991ء میں آپؒ نے سرینام میں The Inter-religious Consults میں بعنوان Shariah Relationship Between Religion and Politics in Islam لیکچر دیا جس میں اسلام کی تعلیم کی رُو سے حکومت کی سیاست میں مذہبی کردار کے اصولوں پر بصیرت افروز حقیقت بین اظہار خیال فرمایا جو ایک سیکولر حکومت کے لئے مشعل راہ ہے اور جذباتی مذہبی دخل اندازی کے انسداد کے لئے اسلامی تعلیم میں ڈبویا ہوا ہتھیار ہے۔ اگر اسے آج دنیا کی مذہبی تنظیمیں لائحہ عمل بنا کر چلیں تو اپنے اپنے ملکوں میں منافرتوں اور فساد کی بجائے امن و سلامتی کے قیام کا موجب بنیں۔

عراق پر امریکی حملہ کے تناظر میں حضور نے 3اگست 1990 تا 15مارچ 1991ء خطبات جمعہ ارشاد فرمائے جو بعد میں اردو میں ''خلیج کا بحران اور نظام جہان نو'' اور انگریزی میں The Gulf Crisis and The new world Order اور عربی میں ''کارثۃ الخلیج والنظام العالمی الجدید'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ یہ خطبات عالمی سیاست اور خصوصاً عالم عرب پر مغربی قوموں کے حرص و ہوس پر استوار ظالمانہ سیاسی حملوں کی گہری سازشوں کے حقیقی تجزیات پر مبنی ہیں۔ عرب دنیا کے موجودہ حالات میں بھی یہ کتاب ان کے لئے امن و سلامتی کا بصیرت افروز پیغام ہے۔

1997ء میں کینیڈا میں جماعت احمدیہ کینیڈا کے جلسہ سالانہ کے موقع پر کینیڈا کے بڑے سیاستدانوں اور دانشوروں کے سامنے Universal Moral Values, Politics and

World Peace کے عنوان پر آپؒ نے خطاب فرمایا اور ان کو اسلام کے مہیّا کردہ خوبصورت اصولوں سے آگاہ کرتے ہوئے دنیا میں امن کے قیام کی طرف متوجّہ فرمایا۔

یہ تو آپؒ کے چند چیدہ چیدہ لیکچروں کا ذکر تھا۔ باقی جہاں تک ہر خطبہ جمعہ اور ہر تقریب اور ہر جلسہ میں آپؒ کے خطاب کا تعلق ہے تو وہ جہاں فصاحت و بلاغت کے شاہکار ہوتے تھے وہاں تعلیم و تربیت اور رشد و ہدایت کے سنہری اصولوں سے بھی نگیں دار ہوتے تھے۔ وہ الٰہی بشارتوں کے دوش پر اور قصص قرآنی کے آئینوں میں جماعت کے لئے امید و حوصلہ اور فتح و ظفر کی نوید بھی ہوتے تھے اور مخالفین کے لئے نکبت و شکست اور انتباہ و انذار کے پیغامبر بھی۔

جماعت احمدیہ کے خلاف فیصلہ کے بعد حضورؒ کے چند ارشادات

7 ستمبر 1974ء کو حکومت پاکستان نے ایک سیاسی غرض کے لئے مسلمان تنظیموں اور فرقوں کے نام نہاد اتفاق کے نام پر جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دیا اور پھر اس فیصلہ کو آئین پاکستان میں شامل کیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مخالفین کو اس فیصلہ کی روشنی میں ان کی حیثیت اور جماعت احمدیہ کو اس کے نتیجہ میں عظیم الشان فتح کے سورج کے طلوع کی خوش خبری دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”یاد رکھو! 7 ستمبر 1974ء کا دن تمہارے لئے رات بن کر آیا ہے اور ہمارے لئے اس دن روشنی کا ایک سورج طلوع ہوا جس نے احمدیت کو بقعہ نور بنا دیا۔ تم نے اکٹھے ہو کر اپنے ہاتھوں سے یہ فیصلہ دے دیا کہ آج محمد مصطفیٰؐ کی پیشگوئی پوری ہوئی اور چونکہ تم اسی فیصلے میں آنحضرتؐ کے نکالے ہوئے نتیجہ کی تکذیب کے مرتکب ہوئے اس لئے وہ پیشگوئی اور بھی زیادہ شان کے ساتھ پوری ہوئی۔ تمہاری اس ظالمانہ روش نے یہ فیصلہ کر دیا کہ تم جھوٹے ہو کیونکہ تم نے نتیجہ وہ نکالا ہے جو محمد مصطفیٰؐ کے نکالے ہوئے نتیجہ کے مخالف ہے۔

پس یہ ہے تمہاری اکثریت اور یہ ہے تمہاری اکثریت کی حیثیت۔ اس اکثریت کی ہمیں ایک کوڑی کی بھی پرواہ نہیں کیونکہ اس اکثریت کی ہمارے آقا و مولا محمد مصطفیٰؐ کو کوئی پرواہ نہیں۔ تم نے ہمیں محمد مصطفیٰؐ سے کاٹنے کے لئے یہ اقدام کیا تھا مگر اس دن نے تو ہمیشہ کے لئے ہمارا پیوند حضرت محمد مصطفیٰؐ سے اور بھی زیادہ پکا کر دیا۔ اگر تم سچے ہو نعوذباللہ من ذلک اور محمد مصطفیٰؐ نعوذباللہ من ذلک غلط ہیں تو ہمیں وہ ایک بننا منظور ہے جو غلط ہو کر بھی ہمارے آقا محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ رہتا ہے۔

ہمیں یہ ہرگز منظور نہیں کہ ہم ان بہتّروں میں شامل ہوں جو ہمارے آقا و مولا محمد مصطفیٰؐ کو منظور نہیں۔ اس لئے جھوٹا کہو گے، تب بھی ہم اپنے آقا محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ رہیں گے۔ سچا کہو گے تو پھر تو ہم ہیں ہی سچے۔ اس لئے اب نکل کے دکھاؤ اس راہ سے۔ خود تمہارا بچھایا ہوا دام ہے جس نے تمہیں گھیر لیا ہے۔ ایک بھی تم میں سے باقی نہیں رہا۔ شیعہ، سنّی کبھی وہم بھی نہیں کر سکتے تھے کہ سارے متفق ہو جائیں گے کہ وہ سب اپنے اختلاف عقائد کے باوجود اس مسئلہ پر متفق ہیں اور یہ کہ ان کے بزرگوں کے سارے فتوے جھوٹے ہیں۔ اس دن خدا نے عظیم الشان فتح کا سورج ہمارے لئے طلوع فرمایا۔ ہم اس پر راضی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِک وَسَلِّم اِنَّکَ حَمِیدٌ مَّجِیدٌ۔''

(خطبہ جمعہ فرمودہ 17/ مئی 1985ء)

1974ء کے اس مذکورہ بالا فیصلے کے بعد اپریل 1984ء میں پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء الحق نے ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ احمدیوں کی روزمرّہ کی زندگی کو قانون کی نظر میں ایک ناقابل معافی جرم بنا ڈالا۔ اس کی رُو سے اگر احمدی اسلامی شعائر کا استعمال کرتے ہیں تو انہیں قید و بند اور نوع نوع کی سزائیں دی جانے لگیں۔ احمدیہ مساجد اور دیگر عمارات سے کلمہ طیبہ اور قرآنی عبارات کو مٹایا جانے لگا۔ احمدیوں کے سینوں سے کلمہ طیبہ کے بیج نوچے جانے لگے۔ سینکڑوں احمدیوں کو کلمہ طیبہ کی محبت کے جرم میں جیلوں میں ڈالا گیا اور ان پر کئی قسم کا تشدد کیا

گیا۔ کئی احمدی اغوا اور شہید ہوئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے پاکستان کے حکمرانوں، سیاستدانوں، اہل فکر و دانش اور عوام کے لئے بعض انتباہ کئے۔ آپؒ نے ان نہایت درجہ ظالمانہ حرکتوں پر بڑے ہی درد کے ساتھ اور دلی ہمدردی کے ساتھ بار بار اہل پاکستان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا اور ایسی حرکتوں سے باز نہ آنے کی صورت میں ملکی حالات کی شدید ابتری سے خبردار فرمایا۔

ذیل میں آپؒ کے ایسے بعض منتخب ارشادات درج کئے جارہے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آپؒ نے جن خطرات کی نشاندہی فرمائی تھی، ان تمام خطرات نے الٰہی تقدیر بن کر پورے ملک کو گھیر لیا۔ حتّٰی کہ ملک کے بڑے بڑے علماء بھی قرآنِ کریم کی آیت ''وَضُرِبَت عَلَيهِمُ الذِّلَّةُ وَالمَسكَنَةُ'' پڑھ پڑھ کر اسے عذابِ الٰہی قرار دینے لگے اور اسے وہی کیفیتِ عذاب قرار دینے لگے جو مسیحؑ کو جھٹلانے کی وجہ سے یہود پر آیا تھا۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ انہی کیفیات کے بارے میں انذار کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے اپنے خطبہ جمعہ فرمودہ 25 مئی 1784ء میں فرمایا:

'' خطرہ یہ ہے کہ اس وقت جو حالات ہیں اس کے نتیجہ میں اگر سابقہ تقدیر خدا کی چلے تو قوم پر بڑے ہی عذاب کے دن آنے والے ہیں۔ بہت ہی دکھ کے دن مقدر معلوم ہوتے ہیں۔ سابقہ اللہ کی تقدیر تو یہی ہے کہ جو مخالفت کی گئی، جو بد ارادے لے کر لوگ اٹھے وہ ان پر الٹائے گئے۔ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝ (الفجر:15-14)

فَصَبَّ عَلَيهِم میں جو اُلٹانے کا نقشہ ہے وہ ہم نے اپنی آنکھوں سے بارہا پورا ہوتے دیکھا ہے۔ ہر وہ کوشش جو جماعت کے خلاف کی گئی ہے بعینہٖ برعکس نتیجہ لے کر مخالفین کے خلاف ظاہر ہوئی۔ اس لئے اب جو کوششیں ہیں وہ بہت ہی زیادہ گندی اور ناپاک ہیں۔ حالت یہ ہے کہ وہ لوگ جو وطن بنانے والے تھے، جو صف اوّل کے شہری تھے ان کو اپنے ہی وطن میں بے وطن کر دیا

گیا ہے۔ اگر یہ حالت تبدیل نہ ہوئی تو ناممکن ہے کہ یہ سزا اس قوم کو نہ ملے جو مظلوموں اور معصوموں کو یہ سزا دے رہی ہے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 25/ مئی 1984ء)

7/ ستمبر 1984ء کے خطبہ جمعہ میں حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

" جب ایک حکومت مظالم میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو ایک وقت مقرر ہوتا ہے جس کے بعد خدا کی پکڑ لازماً آجاتی ہے۔ اگر اس ظلم کا نشانہ خدا والے لوگ ہوں تو پھر لازماً اس کی پکڑ آجاتی ہے۔ اگر اس کا نشانہ عام دنیا والے ہوں تو پھر کوئی ضروری نہیں ہے۔ 'جیسی روح ویسے فرشتے'۔ جس قسم کی دنیا ویسی ہی ان کی حکومتیں، خدا کو کیا ضرورت ہے کہ ہر جگہ ظلموں پر ظالم حکومتوں کو پکڑتا رہے۔ لیکن یہ ایک قانون قدرت ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ساری شریعت کی تاریخ بتا رہی ہے کہ جب بھی کسی سلطان نے خدا کے بندوں پر ہاتھ ڈالا تو اس حکومت کو خدا نے یقینا تباہ کیا۔ آج کیا ہو یا کل کیا ہو لیکن بالآخر جب خدا کی پکڑ آئی تو **وَلَاتَ حِینَ مَنَاصٍ** (ص: 4) پھر ان کے بچنے کی کوئی راہ کبھی نظر نہیں آئی۔ لیکن بعض دفعہ اس پکڑ کے ساتھ جس طرح آٹے کے ساتھ گھُن پس جاتا ہے بعض سادہ اور صاف نفس لوگ بھی مارے جاتے ہیں۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 7/ ستمبر 1984ء)

2/ نومبر 1984ء کو حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

" دنیا کی عدالتیں فیصلہ کیا کرتی ہیں اس سے کوئی انکار نہیں۔ لیکن احکم الحاکمین کے فیصلے بھی ضرور پیچھے آیا کرتے ہیں اور جب خدا کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو تو پھر ایسی قوموں کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ایسی قومیں جو تکبّر میں آکر اللہ کے بندوں کے خلاف فیصلے دیتی ہیں وہ صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہیں۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 2/ نومبر 1984ء)

30/نومبر 1984ء کو حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

"میَں اپنے مخالفین کو متنبہ کرتا ہوں کہ احمدیت کی مخالفت سے باز آجاؤ اور اپنی ان حرکتوں سے توبہ کرو...... انہوں نے براہ راست کلمہ طیّبہ پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے اور چونکہ وہ قوم کی نمائندگی کر رہے ہیں اور قوم ان کے ہاتھ روک نہیں رہی۔ اس لئے اب اس قوم کو مَیں مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اپنے بڑوں کے ہاتھ اس ظلم سے روک لو جو لازماً تمہیں ہلاک کر دے گا... اگر ساری دنیا بھی کلمہ طیّبہ کو مٹانے کی کوشش کرے گی تو لازماً کلمہ اس دنیا کو ہلاک کر دے گا...... اگر تم کلمے مٹاؤ گے تو خدا کی قسم خدا کی غیرت کا ہاتھ تمہیں لازماً مٹا دے گا اور پھر دنیا کی کوئی طاقت تمہیں بچا نہیں سکے گی۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ30/نومبر 1984ء)

7/دسمبر1984ء کو پھر تنبیہ کرتے ہوئے حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

"پاکستان پر بہت ہی خوفناک اور دردناک دن آنے والے ہیں اس لئے مَیں پاکستان کے عوام سے یہ اپیل کرتا ہوں خواہ وہ بریلوی ہوں یا دیوبندی، خواہ شیعہ ہوں یا کسی اور فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں............ کہ اٹھو اور بیدار ہو جاؤ اور ہر اس تحریک کی مخالفت کرو جو کلمہ مٹانے کی تحریک آپ کے پاک وطن سے اٹھتی ہے........... اگر تم وقت پر حرکت میں نہیں آؤ گے تو خدا کی قسم خدا کی تقدیر تمہارے خلاف حرکت میں آجائے گی اور اس ملک کو مٹا کر رکھ دے گی جو آج کلمہ کے نام کو مٹانے کے درپے ہو رہا ہے۔ جس ملک کو کلمہ نے بنایا تھا کلمہ میں اتنی طاقت ہے کہ اگر اس کلمہ کو مٹانے کے لئے وہ سارا ملک بھی اکٹھا ہو جائے تو وہ کلمہ پھر بھی غالب آئے گا اور وہ ملک اس کلمہ کے ہاتھوں سے توڑا جائے گا جس کو کسی زمانہ میں اسی کلمہ نے بنایا تھا۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ/7دسمبر 1984ء)

فوجی آمر ضیاء الحق کو مخاطب کرتے ہوئے حضور رحمہ اللہ نے14دسمبر 1984ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا:

’’جماعت احمدیہ تو خدا کے فضل سے ایک وَلی رکھتی ہے۔ جماعت احمدیہ کا ایک مولیٰ ہے اور زمین و آسمان کا خدا ہمارا مولیٰ ہے۔ خدا کی قسم جب ہمارا مولیٰ ہماری مدد کو آئے گا تو کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ خدا کی تقدیر تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ تمہارے نام و نشان مٹا دئے جائیں گے اور تمہیں دنیا ہمیشہ ذلّت اور رسوائی کے ساتھ یاد کرے گی۔‘‘

’’خدا کی اس تقدیر سے ڈرو کہ زمین میں تمہارے خلاف تَنَادٌ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ایک دوسرے کو تمہارے ظلم اور جبر کے خلاف آوازیں دینے لگے کہ اٹھو اور اس ظالم کو چکنا چور کر کے رکھ دو، اس کو ملیا میٹ کر دو اور اگر یہ بس نہ چلے تو قومیں دوسری قوموں کو اپنی طرف بلائیں۔ یہ تقدیر الٰہی ہے جو لازماً پوری ہو کر رہے گی۔ آج نہیں تو کل تم اس کا نمونہ دیکھو گے کیونکہ خدا تعالیٰ کے ہاں دیر تو ہے اندھیر کوئی نہیں۔

وہ ڈھیل تو دیا کرتا ہے مگر جب اس کی پکڑ آتی ہے تو وَلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ (ص: 4) کی رُو سے بھاگنے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ ایسا کامل گھیرا پڑ جاتا ہے کہ سوائے حسرت و نامرادی کے اور کچھ بھی انسان کے قبضہ و قدرت میں نہیں رہتا۔ اس وقت وہ یاد کرتا ہے کہ کاش مَیں اس سے پہلے اس دائرے سے باہر نکل چکا ہوتا مگر نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں ہوتی۔ افسوس ہے ان قوموں پر جو ایسے وقت تک انتظار کریں کہ جب خدا کی تقدیر ایسی غضبناک ہو چکی ہو تو ان سربراہوں کے ساتھ قوم پر بھی خدا کی ناراضگی کا عذاب ٹوٹ پڑے۔‘‘

(خطبہ جمعہ فرمودہ 14/دسمبر 1984ء)

آپؒ نے 28/دسمبر 1984ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا:

’’جماعت احمدیہ کو کلیۃً نہتّہ بھی کر دیں تب بھی خدا کے فضل سے جماعت احمدیہ ہی جیتے گی کیونکہ خدا کے شیروں کے ہاتھ دنیا میں کوئی نہیں باندھ سکتا۔ یہ زنجیریں لازماً ٹوٹیں گی اور لازماً یہ زنجیریں باندھنے والے خود گرفتار کئے جائیں گے۔ یہ ایک ایسی تقدیر ہے جسے دنیا میں کوئی نہیں بدل سکتا۔‘‘

(خطبہ جمعہ فرمودہ 28/دسمبر 1984ء)

یکم مارچ 1985ء کو حضور رحمہ اللہ نے اہلِ پاکستان کو کلمہ طیّبہ کی خاطر غیرت دکھانے کی طرف توجہ دلائی اور اسی کے پیش نظر انہیں انذار بھی کیا کہ:

”اے اہل پاکستان! میَں تمہیں خبر دار اور متنبّہ کرتا ہوں کہ اگر تم میں کوئی غیرت اور حیا باقی ہے تو آؤ اور اس پاک تحریک میں ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ کلمہ، اس کی عزت اوراس کی حُرمت کو قائم کرو اور دنیا کے کسی آمر اور کسی آمر کی پولیس اور فوج سے خوف نہ کھاؤ۔ یہ وقت ہے اپنی جان کو خدائے جان آفرین کے سپرد کرنے کا۔ یہ وقت ہے خدا کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کا۔ یہ وقت ہے یہ ثابت کرنے کا کہ ہم محمد مصطفیٰؐ کے آگے بھی لڑیں گے اور پیچھے بھی لڑیں گے اور دائیں بھی لڑیں گے اور بائیں بھی لڑیں گے اور آپؐ کی عزت اور ناموس پر کسی کو حملہ نہیں کرنے دیں گے۔

پس اے اہل پاکستان! اگر تم اپنی بقا چاہتے ہو تو اپنی جان، اپنی روح، اپنے کلمہ کی حفاظت کرو۔ مَیں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ اس کلمہ میں جس طرح بنانے کی طاقت ہے اسی طرح مٹانے کی بھی طاقت موجود ہے۔ یہ جوڑنے والا کلمہ بھی ہے اور توڑنے والا بھی۔ مگر ان ہاتھوں کو توڑنے والا ہے جو اُس کی طرف توڑنے کے لئے اٹھیں۔ اللہ تمہیں عقل دے اور تمہیں ہدایت نصیب ہو۔“

(خطبہ جمعہ فرمودہ یکم مارچ 1985ء)

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 18/اگست 2022ء)

ایک شہرہ آفاق صداقت انفاس خطیب

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ

قسط دوم۔ آخری

7/جون 1985ء کو حضور رحمہ اللہ نے ملک کے تمام دانشوروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"تمام اہل فکر و دانش، تمام سیاستدان ان باتوں پر غور کریں اور جو کچھ میں کہہ رہاہوں اس کے متعلق معلوم کریں کہ یہ سچائی ہے یا نہیں... تم انسانی اقدار کو زندہ کرو، انسانی شرافت کو زندہ کرو، حق کو حق کہنا سیکھو۔ باطل کو باطل کہنے کی جرأت اختیار کرو، اس کے بغیر یہ ملک بچتا نظر نہیں آتا۔ یاد رکھیں ایک ہی خطرہ ہے اس ملک کو اور وہ مُلّائیت کا خطرہ ہے جو حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے نہایت ہی بھیانک شکل اختیار کر چکا ہے اور سارے عالم اسلام کو لاحق ہو چکا ہے۔ تم لوگ اس کا ایک حصّہ ہو... ایک ہی نقصان ہے جو ہو گا وہ تمہارا نقصان ہے، ہوتا رہا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے، تمہاری آنکھیں بند پڑی ہیں اور مسلسل ہوتا چلا جائے گا۔ تمہاری کوئی ضمانت نہیں ہے کیونکہ تاریخ بتارہی ہے کہ جب قوموں نے اپنے آپ کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تو خدا کی تقدیر یہ اعلان کیا کرتی ہے کہ ہاں تم ہلاک کئے جاؤ گے اور اس میں اسلام اور غیر اسلام کے ساتھ کوئی فرق نہیں

کیا جاتا۔ بغداد کے وہ مقتول بھی تو مسلمان ہی تھے جو قرآن کو سروں پر لے کر گلیوں میں باہر نکلے تھے اور خدا کے نام پر یہ گواہیاں دے رہے تھے لیکن خدا کی غالب تقدیر نے ان کی ایک نہ سنی۔ کیونکہ اللہ جانتا تھا کہ ظالم قوم نے خود اپنی ہلاکت کے بیج بوئے ہیں۔ اس لئے تمہاری تو یہ تاریخ ہے کوئی نام تمہیں بچا نہیں سکتا۔ جن قوموں پر خدا کے نام پر خدا کی خاطر ظلم ہوتے ہیں اور وہ استقامت دکھاتے ہیں ان کو دنیا میں کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اس لئے تم ہماری فکر نہ کرو۔ ربّ کعبہ کی قسم وہ خود ہماری حفاظت کرے گا۔ تم اس پیارے وطن کی فکر کرو جو ہمیں بھی عزیز ہے اور تم سے زیادہ اس کے نقصان کا دکھ ہمیں پہنچے گا لیکن ہم اس معاملہ میں بے اختیار ہیں سوائے اس کے کہ ایک حرف ناصحانہ کہہ سکیں۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 7/ جون 1985ء)

آپؒ نے 20/ جنوری 1989ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا:

" اگر تمہاری یادداشت چھوٹی ہے، اگر تمہاری نظر کوتاہ ہے تو ہم تمہیں بتا رہے ہیں، ہم تمہیں دکھا رہے ہیں کہ ایسے واقعات پہلے گزر چکے ہیں اور آئندہ بھی اگر تم وہ غلطیاں کرو گے جو پہلے کر چکے ہو تو ویسے ہی نتیجے دیکھو گے جو پہلے دیکھ چکے ہو اور اس قانون قدرت کو کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہے جو سمجھانے والی ہے اور اس کے لئے جماعت کو محنت کرنی چاہئے اور ان لوگوں کو یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ ہم کسی کے دشمن نہیں ہیں اور ہر ایک کی کمزوریوں سے باخبر ہیں۔ ہم جانتے ہیں تم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کی نیّتیں ٹھیک ہیں اس لئے تم اپنے مفاد کی خاطر اگر ہمیں آج قربان کر سکتے ہو تو مجبور ہو کر کر رہے ہو، ہمیں یہ بھی احساس ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم جانتے ہیں کہ اس قربانی کے بعد تمہاری قربانی کا وقت بھی آنے والا ہے۔ اس لئے ہم تمہیں متنبّہ کرتے ہیں کہ جس چھری کو تم آج ہماری گردن پر چلنے کی اجازت دو گے، خدا کی قسم! وہ چھری ضرور تمہاری گردن پر چلائی جائے گی۔ یہ وہ تقدیر ہے جس کو تم تبدیل نہیں کر سکتے اور کبھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن ہماری گردن کی حفاظت کی خدا نے ضمانت دی ہے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 20/ جنوری 1989ء)

14/ اپریل 1989ء کو حضور رحمہ اللہ نے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

" ہمارا تو Birth Mark آنحضرتؐ اور خدا کی محبت ہے اسے کس طرح مٹاؤ گے۔ ہمارے گھروں کو جلا دو، ہمارے جسموں کو جلا دو، ہمارے اموال لوٹ لو، ہماری عورتوں، بچوں اور مردوں کو فنا کر دو مگر خدا کی قسم! محمد مصطفیٰؐ کے خدا کی قسم!! اور کائنات کے خدا کی قسم!!! کہ احمدیت کے دل میں محمد مصطفیٰؐ اور اللہ کی محبت کا جو Birth Mark ہے اس کو تم نہیں مٹا سکتے۔ تمہیں طاقت کیا، استطاعت کیا ہے کہ ان دلوں تک پہنچ سکو؟ تمہاری آگیں جسموں تک جا کر ختم ہو جائیں گی۔ ہاں دلوں تک پہنچنے والی ایک آگ ہے جو خدا جلاتا ہے اور جب وہ فیصلہ کرے گا تمہارے دل پر بھڑکائی جائے گی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں اس آگ کے اثرات سے بچا نہیں سکتی۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 14/ اپریل 1989ء)

27/ ستمبر 1991ء کو حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

" اس زمانہ میں عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں میں اتنی سوچ بھی باقی نہیں رہی کہ وہ باتوں کے آپس میں رشتے تو ملا کر دیکھیں کب سے پاکستان مصیبت میں مبتلا ہوا ہے؟ جب سے احمدیوں کو اسلام سے باہر نکالا ہے۔ اسلام کے اندر اسلام کی برکت کی یہی ایک ضمانت تھی، یہی ایک تعویذ تھا جس کے نام پر اسلام کا تقدّس جاری تھا اور اس تعویذ کو تو آپ نے نکال کر باہر پھینک دیا، پیچھے پھر اسلام کی برکتیں کیا، سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا ہے اور مسلسل اس کے بعد سے سیاست گندی سے گندی ہوتی چلی جا رہی ہے، بکتی جا رہی ہے۔ Horse Trading کا محاورہ ایسے کھلے کھلے استعمال ہوتا ہے جیسے روز مرّہ کی کوئی بات ہے۔ کوئی شرم و حیا کی بات ہی نہیں رہی۔ کرپشن سر سے پاؤں تک، ناخنوں تک پہنچ گئی ہے۔ کوئی زندگی کا ایسا شعبہ نہیں جہاں بد دیانتی کے بغیر کام چل سکے اور بے حیائی ایسی کہ دیکھیں سب کہتے ہیں الحمدللہ اسلام آ رہا ہے، اللہ کا بڑا احسان ہے کہ ہم اسلام کے قریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کہاں اسلام کے قریب ہو رہے ہیں؟ کسی نے کبھی نہیں سوچا۔ اگر یہ ساری بدبختیاں اسلام ہیں تو نَعُوذُبِاللّٰہِ مِن

ذٰلِكَ اس اسلام سے تو دُوری بہتر ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ یہ اسلام نہیں ہے۔ یہ بدبختیاں تمہاری شامت اعمال ہیں۔ تم نے احمدیوں پر مظالم کر کے اسلام سے جو دُوری اختیار کی ہے یہ اس کی سزا ہے ورنہ اسلام سے قرب کی تو خدا سزا نہیں دیا کرتا۔ اسلام سے قرب کی تو جزا ہوتی ہے۔ پس یہ ساری مصیبتیں جو تم پر نازل ہو رہی ہیں تمہیں کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے کہ اسلام سے قرب کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اسلام سے دُوری کے نتیجہ میں ہیں۔ اسلام کے بنیادی حسین منصفانہ قوانین کو تم نے بالائے طاق رکھ دیا بلکہ بھاڑ میں جھونک دیا اور کبھی تم نے ضمیر کی ادنیٰ سی کسک بھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ مقدّس اسلام کو کیسے استعمال کر رہے ہیں؟ اور مَکْرٌ فِی آیَاتِنَا ہے کہ وہ جاری ہے اور مسلسل چلتا چلا جا رہا ہے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 27 ستمبر 1991ء)

8 مئی 1992ء کے خطبہ جمعہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے فرمایا:

" اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (ہود:118)

فرمایا: اگر ہمارے عذاب سے کسی بستی نے بچنا ہے تو ان کے اہل کو مُصلِحُون ہونا پڑے گا۔ یہ نہیں فرمایا کہ شریعت کا قانون جاری کرنا پڑے گا۔ اگر لوگ بدبخت ہیں، لوگ گندے ہیں، ظالم ہیں، سفّاک ہیں تو شریعت کا قانون کیسے ان کو بچا سکتا ہے۔ شریعت کا قانون تو جاری ہو چکا ہے ان بے وقوفوں کو یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی۔ وہ انہوں نے جا کر تھوڑا کرنا ہے۔ وہ تو چودہ سو سال پہلے حضرت اقدس محمد مصطفیٰ ؐپر نازل ہو کر جاری ہو چکا ہے اور اس قانون پر عمل کرنے سے دنیا کی کوئی حکومت روک نہیں رہی............ اگر مسلمان شریعت پر عمل نہیں کر رہے اور محمد مصطفیٰ ؐکی شریعت پر عمل نہیں کر رہے تو ضیاء یا نواز شریف کی شریعت پر کیسے عمل کریں گے۔ کیا یہ خدا سے بڑے لوگ ہیں۔ ان کو علم ہے کہ شریعت تو محمد مصطفیٰ ؐپر خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی۔ پھر بھی اگر وہ عمل نہیں کر رہے اور یہ انتظار کر رہے ہیں کہ ضیاء یا نواز شریف کا قانون جاری ہو تو ہم پھر عمل شروع کریں تو اس شریعت پر عمل کرنے سے تو بہتر ہے کہ جہنّم میں چلے جائیں کیونکہ جو شریعت خدا کی

خاطر نہیں بلکہ بندے کی خاطر اطلاق پاتی ہے تو اس شریعت کی کوئی بھی حقیقت نہیں۔ وہ شرک ہے۔ پس یہ بے وقوفی کی حد ہے۔ اس قوم کو اگر بچنا ہے تو وہی نسخہ استعمال کرنا ہو گا جو قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے۔ وہاں نفاذ شریعت کا حکومت کے تعلق میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ نفاذ شریعت کا بندوں، انسانوں کے تعلق میں ذکر ملتا ہے۔ فرمایا ہے لوگ مصلح بن جائیں گے، اپنی اصلاح کریں گے اور دوسروں کی اصلاح کریں گے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ وہ بچائے جائیں گے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 8/ مئی 1992ء)

11/ دسمبر 1992ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا:

" جب خدا کے گھر کا تقدس لوٹنے والوں سے ایک جگہ تم محبت اور پیار کا سلوک کرتے ہو، ان کو اپنی تائید مہیا کرتے ہو، ان کی پشت پناہی کرتے ہو تو کل جب تمہارے ساتھ یہ ہو گا تو کس طرح خدا سے توقع رکھتے ہو کہ خدا کی تقدیر تمہاری پشت پر آکر کھڑی ہو گی۔

یہ تقدیریں وہی ہیں جو ہمیشہ سے اسی طرح چلی آرہی ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باربار متنبہ کیا کہ دیکھو تم جو حرکتیں کر رہے ہو یہ ضائع نہیں جائیں گی۔ خدا کی تقدیر ضرور تمہیں پکڑے گی۔

؎ قرض ہے واپس ملے گا تم کو یہ سارا اُدھار

تم اپنی مستقبل کی تقدیر بنا رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا خائن عالم ہے جو کل کے مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار ہے اور کل کا خائن عالم تھا جو آج کے مسلمانوں کی بربادی کا ذمہ دار ہے۔ اس خائن کو پکڑو، اس سے حساب لو۔ اگر تم اس خائن سے حساب لوگے تو خدا تعالیٰ کی تقدیر تمہاری تائید میں اٹھ کھڑی ہو گی اور تمہارے مخالفوں سے حساب لیا جائے گا۔ ورنہ تم تو خود حساب دینے کے مقام پر آکھڑے ہوگئے ہو۔ ایک واقعہ نہیں، دو واقعات نہیں، باربار مساجد کی بے حرمتی کی گئی، ان کو ظلموں کا نشانہ بنایا گیا۔ عبادت کرنے والوں کو رستوں میں گھسیٹا گیا، ان کو مارا گیا، ان کو اس بات کی سزا دی گئی کہ کیوں تم خدا کی عبادت کر رہے تھے۔ اور اب جب یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو اچانک

غیرت دینی اٹھ کھڑی ہوئی ہے...... پاکستان میں ایک انگلی نہیں اٹھی جس نے اتنی مسجدوں کی شہادت کے وقت ان ظالموں اور بدکرداروں کو روکنے کی کوشش کی ہو... اگر تم باز نہیں آؤ گے، اپنی اصلاح نہیں کروگے اور خدا کے تعلق کی بنا پر اپنی سوچ کی، اپنی قدروں کی اصلاح نہیں کروگے، اگر اپنے قبلے درست نہیں کروگے تو اسی طرح بھٹکتے رہوگے۔ اسی طرح ظلم کا شکار رہوگے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 11/دسمبر 1992ء)

14/مارچ 1994ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا:

" میں تمہیں خدا کے غضب سے ڈراتا ہوں اور خدا کی قسم! مَیں تمہیں خدا کے غضب سے پھر ڈراتا ہوں۔ اگر تم خدا کے سامنے ایسے باغیانہ رویّے سے باز نہیں آئے تو وہ ضرور تم سے نپٹے گا۔ اور ہماری ہمدردی کی دعائیں بھی تمہارے کسی کام نہیں آئیں گی۔ مگر میں جماعت کو تلقین کرتا ہوں کہ ان لوگوں کی بقا کی خاطر ان لوگوں کو عذاب سے اور عذاب الیم سے بچانے کے لئے دعائیں ضرور کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو عقل دے اور ہوش دے اور ظالمانہ رویّے تبدیل کئے جائیں۔ آراء میں تبدیلیاں پیدا ہوں اور جو ظلم مسلط ہے وہ ظلم اللہ تعالیٰ کاٹ کر الگ پھینک دے۔ اب تو یہی چل رہا ہے کہ بظاہر مُلّاں کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر ہمیشہ سیاست ہے جو احمدی خون اور احمدی عزت کو مُلّاں کے ہاتھوں میں فروخت کرتی ہے۔ مَیں نے ہمیشہ دیکھا ہے جب بھی ایسی خبر آتی ہے کوئی کہ دیکھو آٹھویں ترمیم کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا گیا اور پوری کی پوری جائے گی تو مجھے فوراً سمجھ آجاتی ہے کہ بڑا خطرہ درپیش ہے۔ بعض احمدی بھولے پن میں مجھے لکھتے ہیں کہ الحمدللہ وہ وقت آگیا کہ جب جماعت کے اوپر لٹکی ہوئی آٹھویں ترمیم کی تلوار جو ہے وہ کاٹ کر الگ پھینک دی جائے گی۔ میں ان کو سمجھاتا ہوں بھولے بچو! خدا کا خوف کرو یہ سودا کیا جارہا ہے مارکیٹ میں۔ اعلان کیا جارہا ہے، مُلّاں کو مخاطب کرکے بتایا جارہا ہے۔ یہ ایک چیز ہمارے ہاتھ میں ہے اگر تم باز نہ آئے اور ہم سے تعاون نہ کیا تو پھر ہم یہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ جو وہ اعلان کرتے ہیں اس کی مثال

تو سودا کے اس فقرے کی یاد دلاتی ہے کہ ”لانا بے غنچے میرا قلمدان“ تو یہ سیاستدان قلمدان مانگتے ہیں۔ اگر تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو ہمارے ہاتھ میں قلم ہے اور نوشتۂ تقدیر ہمارے ہاتھ میں آج تھمایا گیا ہے۔ ہم نے اس قلم سے اگر تمہاری امیدوں پر سیاہی پھیر دی تو پھر نہ کہنا ہمیں خبر دار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ہمیشہ بلا استثناء اس ”لانا بے غنچے میرا قلمدان“ کی آواز سن کر مولوی دوڑا چلا جاتا ہے ان کی چوکھٹوں پر سجدے کرتا ہے۔ کہتا ہے جو مرضی کر لو ہم حاضر ہیں، تعاون کریں گے۔ حکومتیں الٹانے میں تمہارے ساتھ ہوں گے لیکن احمدیوں کے متعلق یہ جو تحریر لکھی گئی ہے اس کو منسوخ نہ کریں۔ ایک تو یہ قلم ہے جس کی بات کرتے ہیں۔ ایک صاحب لوح و قلم بھی تو ہے جس کے ہاتھ میں لوح بھی ہے اور قلم بھی ہے، جس کی لکھی ہوئی تقدیر کو کوئی کاٹ نہیں سکتا اور کوئی باطل نہیں کر سکتا۔ مَیں اس خدائے لوح و قلم سے تمہیں ڈراتا ہوں۔ خدا کی قسم اگر تم نے اپنے قلم کا غلط استعمال بند نہ کیا تو خدا کا قلم تمہاری قوموں پر تمہاری ذات پر تنسیخ کا نقش پھیر دے گا۔ تم تاریخ کا حصہ بن جاؤ گے اور دردناک حصہ بن جاؤ گے، عبرتناک وجود بن جاؤ گے۔“

(خطبہ عید الفطر 14/مارچ 1994ء)

1997ء میں پاکستان میں ایک شدید آئینی بحران پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے خطبہ جمعہ 28/نومبر اور پھر 5/دسمبر 1997ء میں روشنی ڈالی اور قوم کے دانشوروں کو قائد اعظم کے تصوّر انصاف کی طرف لوٹنے کی نصیحت فرمائی۔ ذیل میں اس 5/دسمبر خطبہ جمعہ سے اقتباس ہدیۂ قارئین ہے۔ حضور رحمہ اللہ نے فرمایا:

” میں اب بھی یقین رکھتا ہوں کہ اگر یہ آئین جس کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ اسی طرح رہنے دیا گیا اور کوئی اور تبدیلی کا دور ایسا نہ آیا کہ اس آئین کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دے تو یہ آئین ملک کو برباد کر دے گا اور اگر یہ آئین توڑا گیا تو بہتر ہے ورنہ یہ آئین ملک کو توڑ دے گا۔ اس لئے آخری بھلائی اور خیر سگالی ملک کی ہے۔ یہ بات ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں... یہ وجہ ہے جو میں یقین سے کہتا ہوں کہ اگر یہ قانون یا یہ بنیادی ملک کا قانون جماعتی حقوق کو اسی طرح نظر انداز کرتا

رہا اور اس میں مناسب تبدیلیاں نہ لائی گئیں تو پھر یہ قانون خود اس ملک کو چاٹ جائے گا جس ملک نے ہمارے حقوق چاٹے ہوئے ہیں۔ اس میں کسی انسانی کوشش کا کوئی دخل نہیں، کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس ملک کے قانون بنانے والوں کا خود اب آئندہ اس میں امتحان ہے کہ وہ ناجائز، غیر منصفانہ قانون کو ملک پر ٹھونسے رکھیں گے یا اسے تبدیل کریں گے۔...... انقلاب اگر قانون یعنی موجودہ آئین کو بہانہ لے گیا تو پھر وہی بات ہو گی کہ آئین اس ملک کو بہالے جائے گا۔ یہ فکر ہے جس کے لئے میں جماعت کو بھی متوجہ کرتا ہوں کہ دعاؤں میں اس ملک کو یاد رکھیں۔ اکثر احمدیوں کا وطن نہیں ہے کیونکہ بھاری اکثریت احمدیوں کی اب دوسرے ملکوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ لیکن اگر میرا وطن ہے یا ان کا وطن ہے جن کی کوششوں اور قربانیوں سے دراصل ساری دنیا میں احمدیت پھیل رہی ہے تو پھر تمام دنیا کو اس ملک سے اس قدر ہمدردی ہونی چاہئے کہ اسے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ اس ملک کی بھلائی فرمائے اور ملک کی رائیں اور آئین تبدیل ہو لیکن ملک ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ یہ وہ دعا ہے جس کی طرف میں سمجھتا ہوں کہ توجہ کرنا لازم تھا۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 5/دسمبر 1997ء)

12/دسمبر 1997ء کے خطبہ جمعہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے گزشتہ خطبہ جمعہ میں بیان فرمودہ مضمون کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے پاکستان کے دردناک حالات کا ذکر کرکے کھلا کھلا انذار فرمایا۔ تشہد تعوذ اور سورۃ فاتحہ کے بعد حضورؒ نے سورۃ الانعام کی آیات 66 تا 68 کی تلاوت کی اور فرمایا:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٦٧﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٨﴾

ان آیات کا ترجمہ یہ ہے، تو ان سے کہہ دے کہ وہ یعنی اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمہارے

اوپر سے بھی عذاب نازل کرے اور تمہارے پاؤں کے نیچے سے بھی یا تمہیں ایک دوسرے کے خلاف آپس میں مختلف گروہوں کی صورت میں لڑا دے اور تم میں سے بعض کی طرف سے بعض کو تکلیف پہنچائے۔ دیکھ ہم دلیلوں کو کس طرح بار بار بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں۔ اور تیری قوم نے اس امر یعنی پیغام محمد رسول اللہ کو جھوٹا قرار دیا ہے حالانکہ وہ سچا ہے۔ تو ان سے کہہ دے کہ مَیں تمہارا ذمہ دار نہیں۔ ہر ایک پیشگوئی کی ایک حد مقرر ہوتی ہے اور تم جلد ہی حقیقت کو جان لو گے۔

یہ سورۃ الانعام کی وہ آیات ہیں جن کا آج کل ہمارے ملک پر بعینہ اطلاق ہو رہا ہے۔ اور اس قوم نے جو اپنے وقت کے امام کو جھٹلایا ہے جو حضرت اقدس محمد مصطفیٰؐ کا سچا نمائندہ تھا تو عملاً انہوں نے حضرت محمد رسول اللہ کی پیشگوئیوں کا انکار کر کے آپؐ ہی کی تکذیب کی ہے خواہ یہ منہ سے مانیں یا نہ مانیں، اس حقیقت سے کوئی انکار ممکن نہیں۔ اگر حضرت مسیح موعودؑ حضرت اقدس محمد رسول اللہؐ کی پیشگوئیوں کے مطابق ظاہر ہوئے تھے، جیسا کہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپؑ کی پیشگوئیوں کے مطابق ہی ظاہر ہوئے، تو پھر آپؑ کا انکار آنحضرتؐ کے فرمودات کا انکار ہے اور اس انکار کے نتیجہ میں جو کچھ خدا تعالیٰ ایسی قوم سے سلوک فرمایا کرتا ہے ان آیات میں اسی کا ذکر ہے۔

......قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ ان کو بتا دو کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ تمہارے سر کے اوپر سے بھی عذاب لے آئے اور پاؤں کے نیچے سے بھی عذاب نکال دے یا تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے، گروہ در گروہ بانٹ دے يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اور تم میں سے ایک گروہ کی طرف سے دوسرے کو تکلیف پہنچے اور آپس میں لڑائی پیدا ہو اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ دیکھ ہم کس طرح کھول کھول کر اپنے نشانات کو بیان کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ سمجھ سکیں۔ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ اور

تیری قوم نے تجھے جھٹلا دیا حالانکہ جو بات تو لے کر آیا وہ حق تھی۔ قُلۡ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ ان سے کہہ دے کہ میں تم پر نگران نہیں ہوں۔ اللہ کی تقدیر جو فیصلہ کرنا چاہے گی وہ کرے گی اور میں اس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ تمہیں اللہ کی تقدیر سے نہ میں بچا سکتا ہوں نہ کوئی اور بچا سکتا ہے۔ یہ مفہوم ہے قُلۡ لَّسۡتُ عَلَيۡكُمۡ بِوَكِيۡلٍ کا۔ تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو، ان اعمال کی سزا چکھو گے تو مجھے ذمہ دار قرار نہ دو۔ لیکن اِس قوم کو دوسری قوموں کی طرح یہ عادت پڑ چکی ہے کہ اپنے گناہوں کی پاداش کو دوسروں کی طرف منتقل کرتے ہیں۔ وہ ذمہ داری خود قبول کرنے کی بجائے کسی دوسرے پر ذمہ داری ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں.... میں قوم کو دوبارہ متنبّہ کرنا چاہتا ہوں کہ حضرت اقدس محمد مصطفیٰؐ کو مخاطب کر کے قرآن کریم نے جو کچھ فرمایا ہے یہ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے اور مزید ہو گا۔ اگر آپ کو کوئی چیز بچا سکتی ہے تو آپ کی ایک دوسرے سے منافقت اور مناقشت نہیں بلکہ جماعت احمدیہ کی متحدہ دعائیں ہی آپ کو بچا سکتی ہیں۔ جو بچانے والے ہیں ان کو تو آپ نے اپنا دشمن سمجھ لیا ہے۔ جن کی دعائیں خدا کے حضور، خدا کی بارگاہ میں قبولیت کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں ان کو آپ نے اپنا دشمن بنا رکھا ہے اور آپ تو دعا کے مضمون سے ہی ناواقف ہیں۔ صرف چیخ و پکار اور ایک دوسرے کو گالیاں دینا، ایک دوسرے کے گریبان چاک کرنا یہ آپ کا شیوہ بن گیا ہے۔ اس لئے اس ملک سے بدبخت مُلّاں کو نکالو، یہ آپ کی گردنوں پر سوار ہے یہی بحران لاتا ہے اور اگر آئندہ کوئی بحران مزید آیا تو یہی مُلّاں لانے کا سبب بنے گا۔ اس لئے اپنے دشمن کو پہچانو اور عقل کرو۔ اگر پاکستان سے مُلّائیت کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ ملک دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شمار ہونے لگے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا، یہ ایک ایسا بیان ہے جسے قلم زد نہیں کیا جا سکتا۔ آپ چیخیں چلّائیں جو مرضی اس کے خلاف کہیں لیکن اس بات کو اپنے دلوں پر، اپنے سینوں پر لکھ لیں کہ اس ملک سے اگر مُلّاں کا فساد دُور کر دیا جائے اور اسے اس ملک کے امور سلطنت میں دخل اندازی سے کلّیۃً الگ کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ بہت بڑا عظیم ملک بن کر ابھر سکتا ہے۔ پس ہماری یہ تمنا

ہے اور یہ دعائیں ہیں۔ اب انہیں جس طرح چاہیں غلط رنگ میں آپ پیش کرتے رہیں۔ مگر وہ غلط رنگ میں ان کا پیش کرنا آپ کے خلاف جائے گا۔ کیونکہ ہمیں ایک قادر مطلق پر ایمان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اللہ کی نصرت ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہمارے دل کی آہوں کو سنتا ہے۔ اور تمہاری یاوہ گوئی جو سنتا ہے تو تمہارے خلاف ردّ عمل کے لئے سنتا ہے، تمہاری یاوہ گوئی کو خود تمہارے خلاف استعمال کرنے کے لئے تمہاری باتیں سنتا ہے۔ لیکن جماعت احمدیہ کی تائید میں ہمیشہ ہماری پشت پناہی پہ ہمارا خدا کھڑا ہے اور ہمیشہ کھڑا رہے گا آپ اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔"

(خطبہ جمعہ فرمودہ 12/دسمبر 1997ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کے خطبات میں آپؒ کے اندازِ بیان میں جلال اور سچائی اپنی چمک دکھاتی ہے۔ آپؒ کے کئے گئے انذار سے قوم نے فائدہ نہیں اٹھایا تو وہ رفتہ رفتہ اس کے لئے خدا تعالیٰ کی ایسی تقدیر بن کر ظاہر ہوا کہ ساری قوم اس کے نتائج سے کراہنے لگی۔ اس انذار میں آپؒ کی کہی ہوئی ایک ایک بات پوری ہوئی۔ یہ تو اس قوم کا نصیبا تھا لیکن جہاں تک حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی اپنی قلبی کیفیت کا تعلق ہے، آپؒ اپنی قوم کو حقیقی خطرات اور امڈتے ہوئے عذابوں سے بچانے کے لئے بار بار اور مسلسل آگاہ فرماتے رہے۔ خدا کے برگزیدوں کے انذار بھی خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے راستے سے روکیں دور کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ برکتیں اور رحمتیں جو یہ قوم سمیٹ سکتی تھی ان کے لئے آپ انہیں سالہا سال متوجہ کرتے رہے۔ مگر قوم نے خوشخبریوں کے اس اصل پیغام پر نہ توجہ دی اور نہ ہی اس انذار سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ وہ پستیوں کی ڈھلوانوں پر اترتی چلی گئی حتّٰی کہ حقیقی مصائب کا شکار ہو گئی۔

آپؒ نے بار بار اپنی جماعت کو بھی اس ملک اور قوم کے لئے دعاؤں کی اپیل کی اور خود بھی شب و روز دردمندانہ دعائیں کیں۔ آپؒ کو اپنے وطن پاکستان سے بیحد ہمدردی تھی اور اس کے انداز یہ تھے کہ ایک طرف اس کے لئے دل سے اُٹھی ہوئی بے چین دعائیں آپؒ کے لبوں پر مچلتی

تھیں تو دوسری طرف ان کی بہبود کے لئے درجِ ذیل قسم کی تمنّائیں کروٹیں لیتی تھیں۔ آپؒ فرماتے تھے:

"اللہ تعالیٰ قوم کو معاف فرمائے اور عذابوں اور تکلیفوں سے نجات بخشے۔ ویسے میرا ذاتی ایمان یہ ہے کہ جب تک اس ملک میں احمدیت کی عزت واحترام کو قائم نہیں کیا جاتا اور غیر مسلم قرار دیا جاتا ہے، خدا تعالیٰ کی ناراضگی اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس وجہ سے فکر بھی پیدا ہوتا ہے اور دعا کی طرف بھی توجہ ہوتی ہے۔ خدا کرے یہ قوم ہدایت پائے اور قوم کا مقدر جاگ اٹھے اور دنیا کی عظیم الشان قوموں میں شمار ہونے لگے۔ امر واقع یہ ہے کہ اس وقت اگر غریب کی سچی ہمدردی کہیں پائی جاتی ہے تو وہ صرف جماعت احمدیہ میں ہے..... ہر شخص غریب کو سیڑھی بنا کر حکومت کی مسند پر بیٹھتا ہے اور جھوٹے وعدوں سے اس کا پیٹ بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے کراچی کے غریب مصیبت زدہ لوگوں کے حالات پڑھ کر سخت دکھ ہوتا ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو ان کی نئی بستیاں بناتا اور جب تک غرباء کی بہترین آبادیاں تیار نہ ہو جاتیں کراچی کی ترقی کی تمام دوسری سکیمیں بند کر دیتا۔"

آپؒ اپنے ملک و قوم کے لئے خود بھی دست بدعا تھے اور تمام احمدیوں کو بھی جو پاکستان میں مقیم تھے یا بیرونی ممالک میں آئے ہوئے تھے، دردمند دل کے ساتھ دعا کی باقاعدہ تحریک فرماتے تھے۔ آپؒ کی یہ دعائیں اور دعا کی بار بار تحریکات اپنے اندر وہ پیغمبرانہ سوز رکھتی تھیں جو ایک نقصان اور تباہی کی طرف جانے والی قوم کو روکنے کے لئے سچائی اور درد کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ چنانچہ آپؒ فرماتے ہیں:

"پس آج کا پیغام میرا یہی ہے کہ ہمارا وہ ملک جس کے دکھوں کے ستائے ہوئے آپ لوگ یہاں آئے تھے جب خدا کی رضا آپ کو حاصل ہو گئی، جب اللہ نے اپنے پیار کی جنت آپ کو عطا کر دی تو اس کی بخشش کے لئے، اس کی ترقی کے لئے اور اُس کے استحکام کے لئے دعائیں کریں۔ اس کے سوا اپنے دل میں کچھ نہ رکھیں۔

کیونکہ خدا آپ سے یہ توقع رکھتا ہے کہ جب تم نے خدا کی رضا پالی، تمہیں خدا کا پیار مل گیا تو پھر اس کے بعد کسی کا شکوہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ تم ان لوگوں کو معاف کر دو، ان سے محبت کا سلوک کرو۔ ان کے لئے دعائیں کرو اور دعا کرو کہ یہ محروم بھی تمہارے ساتھ مل کر الٰہی جنتوں میں داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! اگر تم دکھ دینے والوں کو معاف کر دو گے تو میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ایسے احسان کرنے والوں سے اللہ بہت ہی محبت کرتا ہے۔ تمہیں اللہ کی محبت کا مقام نصیب ہو جائے گا جو رضائے الٰہی کا بہت ہی پیارا اور آخری مقام ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی جنتوں میں رہیں اور خدا کی محبت اور پیار کی نظریں ہم پر پڑتی رہیں ہم جس حال میں اور جس ملک میں رہیں رضائے باری اور محبت الٰہی کی جنت ہمیں حاصل رہے اور یہ جنت ہم سے کوئی چھین نہ سکے۔“

(خطبہ جمعہ 14/ اکتوبر 1982ء مطبوعہ روزنامہ الفضل 13/ اکتوبر 1983ء)

الغرض حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے قبل از خلافت اور بعد از خلافت پاکستان اور دنیا کے دیگر ممالک، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں علمی انفاس کا ایک خاکہ الگ باب ”سوانحی خاکہ“ میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ جہاں آپؒ کے علم و خطابت کی کثرت کے اندازے مہیّا کرتا ہے وہاں آپؒ کی روشن صفتِ خطابت کی اثر انگیزی، لذّت اور علوشان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

تقاریب آمین، اعلانات نکاح، مجالس و تقریبات میں صدارتی خطابات، مساجد اور جماعتی مراکز کے سنگ بنیاد کی تقاریب پر خطاب یا کلمات، سکولوں، اداروں، مساجد، دفاتر وغیرہ وغیرہ کے افتتاحوں پر خطاب یا کلمات، ان کے علاوہ بھی بہت سے خطاب ہیں جو اس شمار میں نہیں آسکے۔ اسی طرح بعض جگہوں پر تو خطباتِ جمعہ کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اکثر کا ذکر نہیں بھی ہو سکا جبکہ حضورؒ نے اپنے دور خلافت میں سوائے آخری علالت کے دنوں کے، تمام خطبات جمعہ ارشاد

فرمائے۔ بہر حال آپؒ کے علمی انفاس کے بنیادی اور بڑے حصّے کی اس ریکارڈ میں نشاندہی کی گئی ہے۔ ہر بیان ہی ایک علمی خزانہ ہے جو آپؒ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا۔

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 20/ اگست 2022ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ

ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب

قسط 1

ایک ممتاز داعی الیٰ اللہ اور متکلّم

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن خاص اوصافِ حمیدہ سے نوازا تھا ان میں سے ایک نمایاں اور روشن وصف یہ بھی تھا کہ خدا تعالیٰ نے آپؒ کو علم کلام میں خاص اعجاز عطا فرمایا تھا۔ آپؒ کا کلام، اجتہاد اور استنباط ٹھوس علمی بنیاد، عقل سلیم اور نور فراست پر استوار تھا جس کے ساتھ برجستگی، بے ساختگی، جلادت اور ذکاوت آپؒ کو دیگر متکلّمینِ امّت سے ایک ممتاز مقام پر کھڑا کرتی تھی۔ آپؒ کے اس علم کی تاریں علمِ لدنّی سے منسلک تھیں جو خلافتِ حقّہ کے اعجاز کی رونمائی کرتا تھا۔ کئی بار یہ ہوتا تھا کہ آپ نے کسی سوال کا برجستہ جواب دیا مگر اس کی بنیاد حضرت مسیح موعودؑ یا آپؑ کے مقدّس خلفاء کی کتب میں موجود ہوتی تھی۔ مگر آپؒ کے اس جواب کی بنا کوئی کتابی یا منقولی علم نہیں تھا بلکہ وہ لدنّی علم تھا جس کی بنیاد سچائی تھی اور اس کا منبع خود ذات باری تعالیٰ تھی۔ یہ وہی علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر حضرت مسیح موعودؑ کو بھی عطا فرمایا تھا اور پھر

آپؒ کی جانشینی میں حصّہ رسدی آپؒ کے خلفاء کو بھی۔ یہ اعجازی کلام سائل کے عقلی اور علمی افق کے مطابق اس کی تسلّی کا موجب ہوتا یا اس کے لئے مُسکت ضرور ہوتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو گفتگو کا جو خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اس کے ساتھ فطری ذہانت اور خداداد بصیرت مل کر اس گفتگو کو اور بھی پر کشش اور پُر تاثیر بنا دیتے تھے۔ اس لئے سننے والا خواہ وہ کس درجے کا ہی پر خاش جُو کیوں نہ ہوتا، کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوتا تھا۔

ابتداء ہی سے آپؒ کے اندر سچائی پر قیام کے شعور کے ساتھ ایک اعتماد اور وثوق بھی پایا جاتا تھا جس کی بناء پر دوسروں تک اللہ کا پیغام پہنچانے میں آپؒ کو نہ کسی طرح کی جھجک تھی اور نہ ہی کسی قسم کا احساس کم مائیگی۔ چنانچہ آپؒ بیان فرماتے ہیں:

”ہمارے بچپن کا واقعہ ہے کہ ہم کوہ مری میں تھے۔ وہاں ہم ایک چرچ میں مناظرے کے لئے گئے۔ ہمیں یقین تھا کہ ہم جیتیں گے۔ پادری صاحب سے بات ہوئی۔ کچھ دیر ہم ان سے پوچھتے رہے۔ انہوں نے وہی باتیں بیان کیں جو وہ عام طور پر حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق بیان کرتے ہیں ہم نے جب اس کا جواب دیا تو پادری فوراً چونکا اور بولا کیا تم احمدی ہو؟ ہم نے کہاں ہاں۔ اس نے کہا پھر احمدیوں سے ہمارا کوئی مناظرہ نہیں۔“

(الفضل 30/دسمبر 1998ء)

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ساتھ اپنے تعلق اور نسبت کے متعلق بتایا:

”بچپن میں جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا لٹریچر آنحضرتؐ اور اسلام کے دفاع میں پڑھا کرتا تھا تو میں خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرتا تھا کہ اے خدا! جس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے آقا اور مطاع حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کی حفاظت میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں مجھے بھی یہ توفیق دے کہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دفاع میں اسی طرح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری دعاؤں کو قبول کیا۔“

(الفضل انٹرنیشنل 29/اگست تا 4/ستمبر 1997ء)

طالبعلمی کے زمانے میں بھی آپؒ کی دوستیاں بھی سچائی کے پرچار اور اس کی برکتوں سے بھری رہتی تھیں۔ اس سلسلہ میں آپؒ اپنے طریق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”پہلے دوست بناتا تھا۔ پھر دعوت الیٰ اللہ کرتا تھا۔ کافی دوست ایسے بنائے ہوئے تھے کالج میں۔ اوّل تو اچھے لڑکے دوست بنا کرتے تھے۔ پھر دوستی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ بات کھل جایا کرتی تھی پھر دعوت الیٰ اللہ شروع ہو جاتی تھی۔ بہت پیارے پیارے ایسے دوست تھے۔“

(الفضل یکم جولائی 2000ء)

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو شروع سے ہی دعوت الیٰ اللہ کے شوق کے ساتھ اس کا ڈھنگ بھی خوب عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ شاذ ہی ایسا ہوا ہو گا کہ کسی غیر از جماعت فرد سے آپؒ کو بات کرنے کا موقع ملا ہو اور وہ بالآخر جماعت احمدیہ کے تعارف کا خواہاں نہ ہوا ہو۔ ابتداء میں بات خواہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر شروع ہوتی تھی مگر آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت پر منتج ہوتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے آپؒ کو گفتگو اور کلام کا جو خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، اس کے ہمراہ فطری ذہانت اور علم لدنّی اس گفتگو کو پُرکشش بنا دیتے تھے۔ لہٰذا سننے والا ضرور کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتا تھا۔ اس قسم کے واقعات روزمرّہ کی زندگی میں ہمیشہ رونما ہوتے تھے۔

دعوت الیٰ اللہ کے لئے جس حق گوئی، دلیری اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی آپؒ کو پوری طرح آراستہ فرمایا تھا۔ اظہار حق کے لئے نہ آپؒ کبھی کسی استاد سے مرعوب تھے، نہ ہی کسی غیر اللہ سے۔ لہٰذا آپؒ کے غیر مسلم اساتذہ تھے یا کسی بھی شہرت و عظمت یا اقتدار کا مالک کوئی اور شخص، آپؒ پورے اعتماد اور برتری کے مقام سے بات کرتے تھے۔ الغرض دعوت الیٰ اللہ کے لئے ہر وہ خوبی اور وصف آپؒ کو قدرت کی طرف سے ودیعت تھا جو اس کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دراصل آپؒ کی ابتداء تھی جو جلا پاتے پاتے اس نقطۂ عروج پر پہنچی تھی کہ جہاں پھر آپؒ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

آپؒ کے اس وصف کے سفر میں ایک لمحہ آپؒ کے لندن میں طالبعلمی کے زمانہ میں اتر کر دیکھتے ہیں کہ وہاں آپؒ کس طرح اسلام کے دفاع میں مشغول تھے؟ چنانچہ آپؒ اس زمانہ کا ایک واقعہ سناتے ہوئے فرماتے ہیں:

”جب میں لندن پڑھا کرتا تھا تو ایک مرتبہ سؤر کے گوشت کی حرمت کا ذکر آنے پر میں نے اس جانور کی بے حیائی کا ذکر کیا کہ کس طرح اس کے کھانے سے یہی اثر کھانے والے پر ہو جاتا ہے۔ تو ایک لڑکی کھڑی ہوئی اور اس نے کہا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تو میں نے کہا کہ یہی تو میں ثابت کرنا چاہتا تھا۔ یہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جس جانور کا گوشت کھایا جائے وہی خصلتیں اور عادات کھانے والے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

(الفضل انٹرنیشنل 24/دسمبر تا 30/دسمبر 1999ء)

یعنی اس لڑکی کے جواب میں یہ ثبوت موجود تھا کہ اس جانور کے کھانے سے کھانے والے میں بے حیائی کا احساس تک ختم ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ یونیورسٹی آف لندن میں تاریخ کے ایک متعصّب پروفیسر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مدینہ میں یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی غدّاری اور ان کی سزا کے بارہ میں ظلم کا الزام لگایا۔ اس کے دفاع کا ذکر کرتے ہوئے آپؒ فرماتے ہیں:

”میں اور میرے عزیز دوست میر محمود احمد صاحب ناصر اسے برداشت نہ کرسکے اور جواب دینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر اُس پروفیسر نے کہا کہ یہاں بحث کا وقت نہیں۔ تم کو جو کچھ کہنا ہو میرے کمرے میں آکر کہنا۔ مگر ہم نے اسے یہ جواب دیا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہمارے آقاؐ پر حملہ کرو تو تم برسرِ عام کرو اور جواب ہم علیحدگی میں دیں؟ چنانچہ جب ہم نے اس بارہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تو ایک یہودی طالبعلم اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے یہ اعلان کیا کہ ”اگرچہ میں یہودی ہوں اور سب سے زیادہ مجھے اس بات کا غصّہ ہونا چاہئے تھا مگر یہ بحث سننے کے بعد میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس واقعہ سے ہر گز کوئی حرف نہیں

آتا۔ کیونکہ اوّل تو یہ فیصلہ ان کا نہیں تھا۔ دوسرے سعد بن معاذؓ کا فیصلہ بھی میرے نزدیک درست تھا اور وہ غدّار اسی لائق تھے کہ تہِ تیغ کئے جاتے۔“

(مذہب کے نام پر خون، باب بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، صفحہ 65)

1978ء میں یورپ اور امریکہ کے سفر کے دوران حضرت صاحبزادہ صاحبؒ نے ایک شخص سے بات شروع کی جو حسب معمول دعوت الیٰ اللہ تک پہنچ گئی۔ آخر پر وہ کہنے لگا اگر آپ بُرا نہ منائیں تو ایک بات آپ سے پوچھوں۔ آپ تو بہت مہذّب اور تعلیم یافتہ انسان نظر آتے ہیں مگر کیا وجہ ہے کہ آپ کی بیوی اور بیٹیاں اس موجودہ ماڈرن زمانے کے ساتھ چلتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آپؒ نے اسے جواب دیا کہ شاید ان برقعوں اور پردے سے تم نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ مگر بات اس طرح نہیں ہے جیسے آپ سمجھے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تعلیم یافتہ ہیں اور اس دور کے تقاضوں کو بھی بخوبی جانتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی قوم کی عورتیں اب اتنی مہذّب نہیں رہیں۔ تہذیب نے انسان کو رفتہ رفتہ کپڑے پہننا سکھایا تھا کپڑے اُتارنا نہیں۔ آپ کی عورت دوبارہ اس جاہلیت کے دور کی طرف چلی گئی ہے جب انسان بغیر کپڑوں کے شرم محسوس کئے بغیر پھرتا تھا۔ اس بات کو ذرا شگفتہ بنانے کے لئے آپ نے ہنس کر مزید فرمایا: ”ہو سکتا ہے تمہارے خیال میں میری بیوی اور بیٹیوں نے کچھ زیادہ ہی کپڑے پہن لئے ہوں مگر بہرحال یہ اُن خواتین سے بہتر ہیں جو تہذیب کے تمام تقاضوں کو ایک طرف رکھ کر دوبارہ اپنے آپ کو عریاں کرنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کو کلام کا جادو اور بیان کا سحر عطا فرمایا تھا جو بالغ دلیل اور راسخ منطق سے ہمنوا تھا۔ چنانچہ سامع کسی بھی مذہب و ملّت یا مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہو، آپؒ کا خطاب سن کر مسحور ضرور ہوتا تھا۔ آپؒ کی ہر مجلس سوال و جواب شاہد ہے کہ چند ہی ثانیوں میں سامعین، خواہ وہ مخالف عقائد و اعتقاد کے حامل یا کیسے ہی رزم پوش کیوں نہ ہوتے تھے، اکثر کی آنکھیں آپؒ کے بیان کی تائید میں چمک جاتی تھیں اور سر ازراہِ تصدیق میں جھولنے لگتے تھے۔

سوالات کے جوابات میں آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے خاص مقدرت بخشی تھی اور وہ ہر قسم کی صورتحال میں آپؒ کی خود مدد فرماتا تھا۔ آپؒ کی بڑی ہمشیرہ محترمہ صاحبزادی امۃ الباسط صاحبہ نے آپؒ کو خلافت کا منصب عطا ہونے سے پہلے ایک مرتبہ مجالس سوال وجواب کے بارہ میں آپؒ سے پوچھا: ''کبھی پھنسے بھی ہو؟'' جواب دیا:

''ایک مرتبہ پھنسنے لگا تھا جب ایک آدمی نے کہا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن کے بعد سولی سے زندہ اُتر آئے تو آپ اپنا ایک آدمی ہمارے سپرد کر دیں۔ ہم اسے ایک گھنٹے کے لئے سولی پر لٹکا دیں گے۔ اگر وہ زندہ اتر آیا تو آپ کو سچا مان لیں گے۔ یہ سن کر پہلے تو میں گھبرایا لیکن خدا تعالیٰ نے مدد فرمائی اور میں نے کہا کہ آپ مانتے ہیں کہ حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں تین دن تک رہے۔ آپ اپنا ایک آدمی دیدیں، ہم اسے مچھلی کو کھلواتے ہیں، اگر وہ زندہ بچ گیا تو ہم تمہیں سچا مان لیں گے۔''

اسی طرح لاہور کی ایک مجلس سوال وجواب کا واقعہ ہے کہ ایک روباہ باز نے لبالب بھری جوابات سے مسحور مجلس میں اُٹھ کر اچانک اپنی چھل سپولی چھینک کر مجلس پر محیط طلسم حق و صداقت کو توڑنے کی جسارت کی اور کہا: ''مجھے آپ کے چہرے پر کوئی نور نظر نہیں آتا۔''

اس دشمن خشمگیں کا یہ سوال یا تبصرہ بڑا خطرناک تھا کہ حضرت صاحبزادہ صاحبؒ جس کا نہ اثبات میں جواب دے سکتے تھے کہ خودستائشی ممکن نہ تھی اور نہ ہی سچائی کی پُرنور بنیاد پر متمکن ہونے کی وجہ سے نفی کر سکتے تھے۔ جبکہ مجلس ایسی جمی ہوئی تھی کہ جیسے ایک ساکت جھیل کی جامد سطح پر اگر ایک ذرّہ برابر کثافت بھی گرے تو اسے لہر خیز بنا دے۔ اس روح پرور اور ٹھہری ہوئی مجلس میں بے موقع، بے وقت اور اچانک گویا ایک بھاری بھرکم پتھر نے سامعین کے اندر طوفان خیز ارتعاش پیدا کر دیا تھا بلکہ بعض برافروختہ بھی ہونے لگے تھے۔ قوی اندیشہ تھا کہ کوئی جذباتی ہو کر اس پر دست درازی نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ پولیس والے بھی مستعد ہو چکے تھے۔

جواب دینے والا اگر کوئی عام انسان ہوتا تو اس براہِ راست طعن پر تاؤ کھا کر کھٹا پٹی پر اتر آتا۔ مگر حضرت صاحبؒ ایک ایسے صاحب مقدرت جری کی طرح مطمئن تھے جس کی طاقت مدّ مقابل کو اپنی گرفت میں کرنے پر چہرے پر سکون و تسلّی کے آثار ظاہر کرتی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے بڑے اطمینان سے فرمایا:

''میں تو حضرت محمد مصطفیؐ کا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ آپ یہ تو مانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر غیر معمولی نور تھا۔''

اس شخص نے بڑے طمطراق سے جواب دیا کہ اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ بلا شک آپؐ کا چہرہ بے حد نورانی تھا۔ پس حضورؒ نے اسی لمحے عصائے مسیحِ محمدیؐ پھینکتے ہوئے فرمایا: ''لیکن ابوجہل کو تو آپؐ کے چہرے پر وہ نور نظر نہیں آتا تھا۔''

اس عصا کا گرنا تھا کہ مجلس ایک زنّاٹے دار قہقہے سے بھڑک اُٹھی لیکن طرفۃ العین ہی میں وہی پہلے والا سکون و سکوت پھر عود کر آیا۔ مجلس دوبارہ جم گئی۔ سامعین سچائی کے جلوۂ جلال و جمال میں پھر ڈوب گئے اور وہ ابوجہل مثال بدسگال پسینۂ عار میں شرابور منہ بوری ہو گیا۔

ایک دفعہ 1985ء کی گرمیوں میں کیمبرج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم احمدی طلبہ نے حضور رحمہ اللہ کی خدمت میں درخواست کی کہ حضورؒ یونیورسٹی میں تشریف لائیں اور وہاں طلباء اور پروفیسروں کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، ہجرت اور وفات کے موضوع پر لیکچر دیں۔ آپؒ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمالی۔ پروگرام میں آپؒ کے خطاب کے بعد سوالات کا بھی وقفہ تھا اور اس موقع پر شرّ پیدا کرنے کے لئے مسلمان طلبہ تیاری کرنے لگے۔ اس صورتحال کی اطلاع مقامی انتظامیہ کو کر دی گئی تھی تا کہ عملاً کوئی شرارت نہ ہو۔ اس پروگرام میں ایک اچھی تعداد میں یونیورسٹی کے طلبہ اور پروفیسرز تشریف لائے ہوئے تھے اور حضور رحمہ اللہ کے منتظر تھے۔ آپؒ مقررہ تاریخ اور وقت پر کیمبرج یونیورسٹی کے ہال میں تشریف لائے تو سامعین کے ساتھ شرارت کے خواہاں یہ لوگ بھی موجود تھے، ان میں چار ملّاں نما عرب طلبہ بھی تھے۔

پروگرام شروع ہوا۔ مکرّم مصطفیٰ ثابت صاحب نے چند آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت کی اوران کا ترجمہ بھی پیش کیا۔ ان کے بعد حضور رحمہ اللہ نے خطاب فرمایا اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی، ہجرت اور وفات کے بارہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ حقائق پیش فرمائے۔ قرآنی سچائیوں پر مشتمل، امام وقت کے اس خطاب سے ہر ایک متفق بھی نظر آتا تھا اور متأثر بھی۔ یا بالفاظ دیگر جو متفق نہ تھا وہ متأثر ضرور تھا۔ اس صورتِ حال سے چشم شگوں گیر مضطرب بلکہ بے قرار ہو گئی۔ جونہی سوالات کا وقت آیا، انہی عرب طلباء میں سے ایک اٹھا اور کہنے لگا کہ

”آپ غلط باتیں بتا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ آپ نے آیت کریمہ وَاٰوَيۡنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبۡوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيۡنٍ ﴿۵۱﴾ (المومنون: 51) سے غلط استدلال کرتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ کی کشمیر کی طرف ہجرت کی کہانی گھڑ لی ہے۔ آپ عرب نہیں ہیں جبکہ قرآن کریم کی زبان عربی ہے، اسے عرب ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اس آیت میں تو حضرت مریم کی وہ ہجرت بیان کی گئی ہے کہ جب انہیں ارضِ مقدّس سے نکل کر مصر کی طرف جانا پڑا تھا اور حضرت عیسیٰؑ ان کے پیٹ میں ان کے ساتھ تھے۔ اس آیت میں ان دونوں کی اُس ہجرت کا بیان ہے نہ کہ کشمیر کی طرف ہجرت کا۔ کیونکہ واقعہ صلیب کے بعد تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ان دونوں کی کسی ہجرت کا یہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔“

حضور رحمہ اللہ بلا توقف پوڈیم پر تشریف لائے۔ آپؒ کا چہرہ ایک خاص نورانی تجلّی کے ہالہ میں جلال و جمال کے یکساں امتزاج سے دمک رہا تھا۔ اس عالم میں آپؒ نے ایک پُر جلال انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ

”یہ درست ہے میں عرب نہیں ہوں۔ لیکن میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عربوں اور عجمیوں سے زیادہ قرآن کریم کے علم سے نوازا ہے۔ آپ کی بات قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ حضرت مریمؑ کے جس سفر کا آپ ذکر کر رہے ہیں ان کا وہ سفر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کا ہے اور خدا تعالیٰ نے یہاں ”اٰوَيۡنٰهَا“ نہیں فرمایا بلکہ ”اٰوَيۡنٰهُمَاۤ“ فرمایا ہے اور

عرب حاملہ عورت کے لئے کبھی بھی تثنیہ کا صیغہ استعمال نہیں کرتے بلکہ واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں صرف اس سفر کا ذکر ہے جو خدائی منشا کے تحت حضرت عیسیٰؑ نے اپنی والدہ کے ساتھ واقعہ صلیب کے بعد اختیار فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور سفر پر اس آیت کریمہ کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس وقت اس معترض کی حالت وہی تھی جو آیت کریمہ ''فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ'' (کہ وہ منکر لاجواب ہو کر مبہوت ہو گیا) میں بیان ہوئی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ نے اسے ابھی مزید آبرو باختہ کرنا تھا۔ چونکہ اس نے عرب ہونے کے ناتے عربی دانی کی بڑ ہانکی تھی اس لئے اللہ تعالی نے اس کی خجلت آمیز شکست کا یہ سامان ایک عرب ہی کے ذریعہ کیا۔ ہوا یوں کہ اپنا جواب مکمل کرتے ہی حضور رحمہ اللہ نے مکرم مصطفیٰ ثابت صاحب سے پوچھا:

"کیا کوئی عرب، کبھی حاملہ عورت کے لئے تثنیہ کا صیغہ "هُمَا" بھی استعمال کرتا ہے؟"

مصطفیٰ ثابت صاحب برجستہ بولے Yes, Huzoor : اور پھر انہوں نے ایک ڈرامائی انداز میں کچھ توقف کیا۔ جس پر اس عرب معترض اور اس کے ساتھیوں کے ہونٹوں پر طنز آمیز فاتحانہ مسکراہٹ بکھرنے کو ہی تھی کہ مصطفیٰ ثابت صاحب بولے:

"If he is an ignorant Arab!!!"

(یعنی سوائے جاہل عرب کے اور کوئی ایسا نہیں کہہ سکتا) یہ سننا تھا کہ محفل ایک لمحے کے لئے ایک اجتماعی قہقہے سے چمک اٹھی۔ چونکہ یہ ایک سنجیدہ اور علم کی سچائی سے بھرپور مجلس تھی اس لئے سب نے اس شر خواہ زک شدہ عرب پر ایک چشم جہت بیں ڈالی اور خاموشی سے سوالات کے پُر حقائق جوابات سے لطف اندوز ہونے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ شریروں کو بھری مجلس میں عرق خجالت میں اس حد تک غرق کر دیا کہ پھر ان میں سے کسی کو اور کسی حرکت کی جرأت نہ ہوئی، بلکہ غیب سے خلیفۂ وقت کی تائید فرما کر احمدیت کے علم کلام کی صداقت کا نشان مزید پختہ اور قائم فرما دیا۔

حضور رحمہ اللہ جب یہ جواب ارشاد فرمارہے تھے تو آپؒ پر الٰہی تصرف جلوہ گر تھا۔ چنانچہ پروگرام کی تکمیل کے بعد جب کیمبرج سے لندن واپسی پر خاکسار (راقم الحروف) نے اس ''ھَا'' اور ''ھُمَا'' والے پُر معرفت و پُر حقیقت مسکت نکتہ کے بارہ میں سامعین کے لطف و سرور کا ذکر کیا تو آپؒ نے فرمایا:

''مجھے اس نکتے کا نہ تو پہلے کوئی علم تھا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی کتاب میں یہ پڑھا تھا۔ عین اسی وقت اللہ تعالیٰ نے میری زبان پر یہ القا کیا تھا اور میری زبان خود بخود اسے بیان کر رہی تھی۔''

فَسُبْحَانَ الَّذِیْ اَخْزَی الْاَعَادِی

قارئین کرام! کسی سوال کرنے والے کی علمی، عقلی اور منطقی لحاظ سے تشفّی کرانا اور اسے سچائی کی طرف مائل کر دینا ایک حق پرست متکلم ہی کی اعلیٰ خوبی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک معاند کے حملے سے بچنا اور مائلِ حق سامعین کو اس کی زد سے بچانا بھی اس کی اعلیٰ صفات میں سے ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایسی ہر صفت سے متّصف تھے جو دین حق کی سچائی کے ثبوت کے لئے ضروری تھی۔ اس کے ساتھ آپؒ کو متلاشیان حق ہوں یا معترض، سچّائی آشکار کرنے کے لئے ان کے سوالوں کے جواب دینے میں جو گوناں سکون اور لذّت حاصل ہوتی تھی وہ بیحد تھی۔

آپؒ اپنے ایک خط محررہ 12/مئی 1982ء میں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کل کی مجالس مذاکرہ میں دو تین کالج کے وفود بھی آئے ہوئے تھے۔ گفت و شنید اتنے پیارے اور پُر سکون ماحول میں ہوئی اور سوالات اتنے علمی اور دلچسپ تھے کہ مزا آگیا۔ جھنگ سے جو وفد آیا تھا وہ عموماً تاجروں پر مشتمل تھا اور کچھ مولوی بھی تھے لیکن سلجھے ہوئے تھے۔ اس طرح شیخوپورہ کا وفد بھی بہت اچھا تھا۔ چار گھنٹے مسلسل بولنے کے باوجود طبیعت کو اتنا سکون ملا کہ دن کے پہلے حصّے کی تھکاوٹ بھی جاتی رہی۔ احمدیّت کے حق میں لوگوں کے چہروں کے نقوش ملائم ہوتے دیکھ کر دل حمد سے بھر جاتا تھا اور جب سختیاں نرمی میں بدلتی تھیں اور نرمی محبت کا رنگ پکڑنے لگتی

تھی، روح شکر کے ترانے گاتی تھی کہ میرے جیسے بے کار اور گنہگار انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی ورنہ میں خدمت گاروں میں لکھے جانے کے لائق بھی نہیں۔"

آپؒ کی ابتدائی زندگی کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم میں آپؒ کا مزاج محض اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں خاص سمت میں تھا۔ اسکول و کالج اور جامعہ احمدیہ وغیرہ کی مروّجہ اور واجبی تعلیمات کے حصول کے ساتھ ساتھ آپؒ اپنی طبعی کشش کے ساتھ اس خاص جانب رواں دواں رہے۔ اس جہت میں آپؒ دنیا بھر کے علوم جو قولِ خدا یعنی قرآن کریم کی حقانیّت کے ثبوت کے لئے ضروری تھے گہری دلچسپی کے ساتھ حاصل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو ان علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ ان کے اظہار کے مواقع بھی عطا فرمائے اور جہاں امکان ہوتا آپؒ انہیں خود عملاً تجربہ کرکے بھی مشاہدہ فرماتے تھے۔ بالآخر آپؒ امّت میں متکلّمین کی صفِ اوّل میں آ کھڑے ہوئے۔ اس میدان میں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو اس قدر وسعت عطا فرمائی کہ اپنے پیچھے دروس، خطبے، خطابات، لیکچرز، مجالسِ سوال و جواب اور اعتراضات کے جوابات کا ایک لاثانی ذخیرہ چھوڑ گئے۔ جس سے امّت صدیوں تک سیراب اور فیضیاب ہوتی رہے گی۔ ان شاء اللّٰه العزیز

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 22/ فروری 2023ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ

ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب

قسط 2

ایک صاحبِ طرز ادیب

حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمدؒ کے قلم کو خدا تعالیٰ نے ابتداء ہی سے اپنے خاص فضل سے نثر نگاری کے زیور سے آراستہ فرمایا تھا۔ چنانچہ آپؒ نے 1944ء میں اپنی عظیم والدہؓ کی وفات پر جو مضمون "میری ماں" کے عنوان سے تحریر فرمایا، آپؒ کی ادبی صلاحیت کا مظہر ہے۔ یعنی میٹرک کے زمانہ میں بھی آپ کی تحریر شستہ اور پختہ تھی۔ خط لکھنا بھی بچپن سے ہی آپؒ کا ایک مرغوب مشغلہ تھا۔ اس مشغلہ میں ہی کبھی ایک قادر الکلام ادیب جھانکتا ہوا اور کبھی بالائے بام زہرہ فن نظر آتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جس کی دسترس نثری سمندر کی پنہائیوں پر بھی ہوئی ہے اور شعری ذخائر کی وسعتوں پر بھی۔ اسی طرح بالآخر آپؒ کی تحریریں تحریری شہادت مہیّا کرتی ہیں کہ ان مذکورہ بالا خوبیوں کے ساتھ ساتھ محاوروں اور ضرب الامثال کی بروقت اور برمحل آمد، تصویر کشی، منظر نگاری اور الفاظ کا برمحل چناؤ بھی آپؒ کے قلم سے جادو اتارتا ہے۔ یہ سب آپؒ کی تحریر کے نمایاں محاسن میں سے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ آپؒ نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی بیماری کے آخری لمحات کا جو منظر پیش کیا ہے، وہ قاری کو بڑی شائستگی کے ساتھ اس ماحول میں ان درد بھری کیفیات میں اتار دیتا ہے۔ چنانچہ آپؒ تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے نہایت ہی پیارے امام، میرے محبوب روحانی اور جسمانی باپ حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیماری کے آخری چند لمحات کی یاد ایک نہ مٹنے والا نقش ہے۔

شام سے طبیعت زیادہ خراب تھی اور مسلسل سانس کو درست رکھنے کے لئے آکسیجن دی جا رہی تھی۔ چھاتی میں رسوب زیادہ بھر رہا تھا جسے بار بار نکالنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور مکرم محترم ڈاکٹر قاضی مسعود احمد صاحب اور برادرم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب بار بار معائنہ فرماتے اور رسوب کا اخراج خود اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے۔ بچوں میں سے دو تو ڈیوٹی پر تھے اور باقی تمام ویسے ہی جمع تھے۔ خاندان کے بڑے چھوٹے سبھی کے دل اندیشوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے تاہم زبان پر کوئی کلمہ بے صبری کا نہ تھا اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا تھا۔ اندیشے دھوئیں کی طرح آتے اور جاتے تھے۔ توکل علیٰ اللہ اور نیک امید غیر متزلزل چٹان کی طرح قائم تھے۔ وہ جو صاحب تجربہ نہیں شاید اس بظاہر متضاد کیفیت کو نہ سمجھ سکیں لیکن وہ صاحب تجربہ جو اپنے ربّ کی قضاء کے اشاروں کو سمجھنے کے باوجود اس کی رحمت سے کبھی مایوس ہونا نہیں جانتے میرے اس بیان کو بخوبی سمجھ جائیں گے۔ پس افکار کے دھوئیں میں گھری ہوئی ایک امید کی شمع ہر دل میں روشن تھی اور آخر تک روشن رہی تاہم کبھی کبھی یہ فکر کا دھواں دم گھونٹنے لگتا تھا۔ دعائیں سب ہونٹوں پر جاری تھیں اور ہر دل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔

حضورؓ پر کبھی غنودگی طاری ہوتی تو کبھی پوری ہوش کے ساتھ آنکھیں کھول لیتے اور اپنی عیادت کرنے والوں پر نظر فرماتے ایک مرتبہ بڑی خفیف آواز میں برادرم ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب کو بھی طلب فرمایا۔ لیکن جیسا کہ مقدّر تھا رفتہ رفتہ یہ غنودگی کی کیفیت ہوش کے وقفوں پر غالب آنے لگی اور جوں جوں رات بھیگتی گئی غنودگی بڑھتی رہی۔ اس وقت بھی گو ہماری تشویش

بہت بڑھ گئی تھی لیکن یہ تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ حضورؒ کی یہ آخری رات ہے جو آپ ہمارے درمیان گزار رہے ہیں۔ تقریباً گیارہ بجے شب میں ذرا ستانے اور ایک لاہور سے تشریف لائے ہوئے مہمان کو گھر چھوڑنے گیا اور عزیزم انس احمد کو تاکید کر گیا کہ اگر ذرا بھی طبیعت میں کمزوری دیکھو تو اسی وقت بذریعہ فون مجھے مطلع کر دو۔

نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹے ابھی چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ فون کی دل ہلا دینے والی گھنٹی بجنے لگی۔ مجھے فوری طور پر پہنچنے کی تاکید کی جا رہی تھی۔ اُسی وقت جلدی سے وضو کر کے ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں وہاں پہنچا۔ قصرِ خلافت میں داخل ہوتے ہی مکرم ڈاکٹر مسعود احمد صاحب اور مکرم ڈاکٹر ذکی الحسن صاحب کے پژمردہ چہروں پر نظر پڑی جو باہر برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ حضورؒ کے کمرہ میں پہنچا تو اور ہی منظر پایا۔ کہاں احتیاط کا وہ عالم کہ ایک وقت میں دو افراد سے زائد اس کمرہ میں جمع نہ ہوں اور کہاں یہ حالت کہ افراد خاندان سے کمرہ بھرا ہوا تھا حضرت سیّدہ ام متین اور حضرت سیّدہ مہر آپا بائیں جانب سرہانے کی طرف اُداسی کے مجسمے بنی ہوئی پٹی کے ساتھ لگی بیٹھی تھیں۔ برادرم حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب دائیں طرف سرہانے کے قریب کھڑے تھے اور حضرت بڑی پھوپھی جان اور حضرت چھوٹی پھوپھی جان بھی چارپائی کے پہلو میں ہی کھڑی تھیں۔ میرے باقی بھائی اور بہنیں بھی جو بھی ربوہ میں موجود تھے سب وہیں تھے اور باقی اعزاء و اقرباء بھی سب ارد گرد اکٹھے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر دعائیں تھیں اور سب کی نظریں اس مقدّس چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ سانس کی رفتار تیز تھی اور پوری بے ہوشی طاری تھی۔ چہرے پر کسی قسم کی تکلیف یا جدّوجہد کے آثار نہ تھے۔ میں نے کسی بیمار کا چہرہ اتنا پیارا اور ایسا معصوم نظر آتا ہوا نہیں دیکھا۔ میں نہیں جانتا کہ اس حالت میں ہم کتنی دیر کھڑے رہے اور سانس کی کیفیت میں وہ کیا تبدیلی تھی جس نے ہمیں غیر معمولی طور پر چونکا دیا۔

اُس وقت مجھے پہلی مرتبہ یہ غالب احساس ہوا کہ گو خدا تعالیٰ قادرِ مطلق اور حی و قیوم ہے اور ہر آن اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے لیکن وہ تقدیر جس سے ہمارے نادان دل گھبراتے تھے وہ تقدیر

آ پہنچی ہے۔ پس اُس وقت میں نے قرآن کریم طلب کیا اور اس مقدّس وجود کی روحانی تسکین کی خاطر جس کی ساری زندگی قرآن کریم کے عشق اور خدمت میں صرف ہوئی سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ ایک مشکل گھڑی تھی اور سر سے پاؤں تک میرے جسم کا ذرّہ ذرّہ کانپ رہا تھا۔ اُس وقت مجھے صبر کی طنابیں ڈھیلی ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُس وقت میں نے اپنے چاروں طرف سے گھٹی گھٹی سسکیوں کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنیں لیکن خدا گواہ ہے کہ ہر سسکی دعاؤں میں لپٹی ہوئی اور ہر دعا آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

سورہ یٰسین کی تلاوت کے دوران ہی میں سانس کی حالت اور زیادہ تشویشناک ہو چکی تھی اور تلاوت کے اختتام تک زندگی کی کشمکش کے آخری چند لمحے آ پہنچے تھے۔ میں نے قرآن کریم ہاتھ سے رکھ دیا اور دوسرے عزیزوں کی طرح قرآنی اور دیگر مسنون دعاؤں میں مصروف ہو گیا۔ حضورؒ نے ایک گہری اور لمبی سانس لی جیسے معصوم بچے روتے روتے تھک کر لیا کرتے ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ آپ کی آخری سانس ہے۔ اُسی وقت میں نے ایک ہومیوپیتھک دوا کے چند قطرے پانی میں ملا کر اپنی تشہد کی انگلی سے قطرہ قطرہ حضورؒ کے ہونٹوں میں ٹپکانے شروع کئے اور ساتھ ہی بے اختیار ہونٹوں پر یہ دعا جاری ہو گئی کہ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ نَسْتَغِیْثُ۔ اس وقت سانس بند تھے اور جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا اور بظاہر زندگی کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن اچانک ہم نے حیّ و قیوم خدا کا ایک عظیم معجزہ دیکھا۔ مجھے حضرت پھوپھی جان کی بے قرار آواز سنائی دی کہ دیکھو ابھی پاؤں میں حرکت ہوئی تھی اور ان الفاظ کے ساتھ ہی ہونٹوں میں بھی خفیف سی حرکت ہوئی اور سانس لینے کا سا اشتباہ ہوا۔ معاً شدید کرب اور بے چینی سکینت میں بدل گئے اور ہر طرف سے یا حیُّ یا قیوم کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور جوں جوں ہم دعا کرتے رہے حضورؒ کے سانس زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ ڈاکٹر بھی جو جسم کو بظاہر مردہ چھوڑ کر چلے گئے تھے واپس بلائے گئے اور بڑی حیرت سے اس معجزانہ تبدیلی کا مشاہدہ کرنے لگے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حضورؒ کی زندگی کا بظاہر جسم کو چھوڑ دینے کے بعد معجزانہ طور پر پھر واپس لوٹ آنا محض ہمارے دلوں کو سکینت عطا

کرنے کی خاطر تھا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے گویا ایک فضل و احسان کا پھایہ تھا جو ہمارے قلوب پر رکھا گیا۔

چنانچہ اس کے تقریباً بیس منٹ کے بعد حضورؒ کو اپنے آسمانی آقا کا آخری بلاوا آ گیا۔ اس وقت کا منظر اور کیفیت نا قابلِ بیان ہیں۔ ہم نے آسمان سے صبر اور سکینت کو اپنے قلوب پر نازل ہوتے ہوئے دیکھا اور یوں محسوس ہوا جیسے ضبط و تحمل کی باگ ڈور رحمت کے فرشتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ آنکھوں سے آنسو ضرور جاری تھے اور دلوں سے دعائیں بھی بدستور اٹھ رہی تھیں مگر سب دل کامل طور پر راضی برضا اور سب سر اپنے معبود، خالق و مالک کے حضور جھکے ہوئے تھے۔ ہم ٹکٹکی لگا کر اسی طرح خدا جانے کب تک اُس پیارے چہرے کی طرف دیکھتے رہے جسے موت نے اور بھی زیادہ معصوم اور حسین بنا دیا تھا۔ اُس تقدّس کے ماحول میں جس کی فضا ذکر الٰہی سے معمور تھی اور جس کی یاد کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔ حضورؒ کی نعش مبارک نور میں نہائی ہوئی ایک معصوم فرشتے کی طرح پڑی تھی۔ دل بے اختیار ہم سب کے دل و جان سے زیادہ پیارے آقا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے بعد یہ کہتا تھا۔ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ ﴿۲۸﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً ﴿۲۹﴾ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خط و کتابت اور دیگر تحریروں میں جگہ جگہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آپؒ کے عام خطوط بھی شاہکار ادب پارے ہیں مگر جو تحریریں آپؒ نے قدرے توجّہ اور شوق سے لکھی ہیں، آپؒ کی فلک رسا قلم کے جلوے دکھاتی ہیں۔ خط نویسی میں آپؒ کے کلکِ گوہر بار سے جھڑنے والے چند پھول پیش ہیں جو اپنی خوشبو کے ساتھ ادبی طلسمات بھی بکھیرتے ہیں۔

یہ اقتباسات ان خطوط سے لئے گئے ہیں جو حضورؒ نے لندن سے مکرّم ڈاکٹر سید برکات احمد صاحب مرحوم کو لکھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم وہ قابل رشک وجود ہیں جنہوں نے شدید بیماری کی حالت میں حضورؒ کی کتاب ''مذہب کے نام پر خون'' کا ایسا خوبصورت انگریزی ترجمہ Murder In The Name Of Allah کیا کہ اس نے حضورؒ کی محبت کو بھی کھینچا اور داد کو بھی۔ داد دینے میں

آقا نہ صرف فراخ دلی سے کام لیتے ہیں بلکہ داد ہی داد میں اپنی تحریر میں ایسے موتی بھی پرو دیتے ہیں کہ داد کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور اس کا اثر دَہ چند۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”جتنی مجھے آپ کی بیماری کی فکر ہے اور جس طرح روزانہ عاجزانہ دعا کرتا ہوں اگر اس باقاعدگی سے عیادت کے خط لکھنے کی توفیق پاتا تو خطوں کا ایک انبار آپ کے پاس لگ جاتا۔ آپ کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت کی خاموش، پروقار سطح کے نیچے علم و ادب، شعریت اور نغمگی اور لطافتوں کا ایک بحرِ ذخّار موجزن ہے جس میں موتی اور مونگے اور انواع و اقسام کے معدنیاتی خزائن سطحی نظروں سے اوجھل پڑے ہیں۔ ہے تو یہ میٹھے پانی کا سمندر لیکن سیلِ حوادث نے اس میں کچھ تلخی کی آمیزش کر دی ہے.... جو شعر میرے ذہن میں آیا وہ یہ ہے:

؎ چشم حزیں کے پار اُدھر، دردِ نہاں کی جھیل پر
کھلتے ہیں کیوں کسے خبر، حسرتوں کے کنول پڑے

تعریف کا ایک اور پیارا انداز اور ادب کا ایک شہ پارہ ملاحظہ ہو۔ تحریر فرماتے ہیں:

”ایک لمبی، تکلیف دہ، پُرعذاب بیماری نے آپ کے دل کے چمن کے بہت سے پھول کملا دیئے۔ لیکن فصاحت و بلاغت اور ادب و لطافت کی شاخ نہال ہری بھری رہی۔ آپ کا قلم اب بھی موج خرام ناز کی طرح چلتے ہوئے گل کترتا ہے۔ اللہ آپ کے علم کو اور بھی جلا بخشے اور قلبی صلاحیتوں کو پہلے سے بڑھ کر جلوہ آرائی کی توفیق بخشے۔“

اس قادرالکلام آقا کا ایک اور اندازِ تحریر ملاحظہ ہو۔ دیکھیں کس طرح دوسرے کی تعریف بھی مقصود ہے اور ان کے کام کو سراہنا بھی۔ مگر اندازِ تعریف بھی دیکھئے کیسا کھلا اور بے تکلف، کیسا خوبصورت، کیسا شگفتہ، کیسا ادیبانہ بلکہ شاعرانہ ہے۔ آپؒ تحریر فرماتے ہیں:

”آپ کا خط پڑھتے پڑھتے دلِ شوریدۂ غالب طلسم پیچ و تاب کے بارہ میں کچھ اندازہ ہوا کہ غالبؔ کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اگر کسی اور دل پر وہ گزرتی تو شاید وہ کیفیت پردۂ راز میں ہی رہتی مگر غالبؔ نے پردۂ راز کو پردۂ ساز میں بدل دیا۔

پہلے تو احساس ندامت بہت ہوا کہ مَیں نے کیوں نادانستہ آپ کا دل دکھایا۔ پھر خط کے بے پناہ حسن نے توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ خط کیا ہے طلسمات کا ایک مرقع، ایک فسانۂ عجائب۔ ایک فنکار کا سراپا لئے ہوئے۔ ایک آئینہ بھی ہے۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ کبھی کسی اور خط میں بھی آپ کی شخصیت اس آن بان کے ساتھ کاغذی پیرہن میں ملبوس ہوئی ہو کہ یوں لگے جیسے پیکرِ تصویر خود فریادی بن کر چلا آیا ہے۔

آپ کا ہر خط فصیح و بلیغ اور بہت مہذّب ہوتا ہے۔ زبان کی شستگی طرز تحریر کی شائستگی ایک ایسے اعلیٰ پائے کے ادیب کی غماز ہوتی ہیں جس نے اپنی خداداد فکری و قلبی صلاحیتوں کو برسوں مانجھا اور صیقل کیا ہو اور بڑی قدر دانی کے ساتھ سر آنکھوں پر بٹھائے، سینے سے لگائے لگائے پھرا ہو۔ لیکن آپ کا یہ خط تو گزشتہ خطوں پر بازی لے گیا ہے۔ آپ لفظوں ہی کے نہیں معانی کے بھی ''مداری'' نکلے اور مشہودات پر ہی نہیں، محسوسات پر بھی مَیں نے آپ کے قلم کا جادو چلتے دیکھا۔ پہلے بھی آپ کے سب خط سنبھال کر رکھے تھے۔ اسے تو ان کے بیچ میں سجا کر رکھوں گا۔''

کتنی قدر دانی! کتنا پیار! کیا خوبصورت تعریف جس میں ادب کی چاشنی بھی، اپنائیت بھی اور محبت بھی۔ ایک ہمدرد، شفیق، مہربان، غمگسار اور فرستادہ آقا کی تحریریں جو جان بخش بھی ہیں اور دلنواز بھی۔ اپنی عزیزہ امۃ الجمیل صاحبہ کو ایک سفر کے دوران متفرق حالات میں لپٹی ہوئی اپنی قلبی کیفیات کے بارے میں لکھا:

''سوچتے سوچتے اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے دل کا وہ خانہ بدوش جو مدّت سے سویا پڑا تھا بیدار ہو چکا ہے اور مجھے کہتا کہ چلو کہیں اکیلے چلیں۔ اس کے بار بار کے اصرار پر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں نے اسے جواب دیا کہ دیکھو کوئی انسان اپنے ماضی کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ میں بالکل بے بس اور بے اختیار ہوں۔ اس نے مجھے کہا۔ بہت اچھا، تم یادوں کا سفر تو کر سکتے ہو ناں۔ اب اٹھ کر دفتر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ ایک پُرسکون تاریخی سفر کے لئے صرف 15 منٹ مجھے دے دو اور میری انگلی پکڑ کر میرے ساتھ چلو۔ میں نے یہ بات اس کی مان لی

اور ہم ایک عجیب پُر لطف مگر دل گداز سفر پر روانہ ہوئے۔ میرے دل کا خانہ بدوش میرے ساتھ بھی تھا مگر پھر بھی میں تنہا تھا۔"

یہ ادب پارے دنیا کی وسعتوں پر پھیلے ہوئے احمدیوں کے ساتھ آپؒ کی خط و کتابت میں پھیلے ہوئے ہیں جو جگہ جگہ، قریہ قریہ اور ملک ملک نادر نگینوں کی طرح اپنی چوطرفی اور ست رنگی چمک مہیّا کرتے رہیں گے۔ یہاں صرف نمونے کے طور پر مشتے از خروارے پیش کئے گئے ہیں۔

چونکہ آپؒ کا تحریری جہاد بھی اسلام اور احمدیت کی حقانیت کے ثبوت میں تھا اس لئے اس میں ادب کے ساتھ ساتھ علم کلام کا سلطان بنیادی اکائی کے طور پر غالب ہے۔ لہٰذا آپؒ متکلّم ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب بھی ہیں اور یہ دونوں صفات جڑواں طور پر آپؒ کی ذات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

صاحبِ منطق و دلیل مصنّف

آپؒ کے مضامین جونہی شائع ہوتے، انہیں فوری طور پر ذوق و شوق سے بکثرت پڑھا جاتا تھا۔ ماہنامہ الفرقان ربوہ میں "طاعون" کے بارے میں جو مضمون شائع ہوئے۔ تحقیق و حقائق پر مبنی بصیرت افروز مضمون تھے جو اپنی مقبولیت میں بے نظیر تھے۔ اسی طرح رِبوٰ (سود) کے بارے میں آپؒ کا تحقیقی مضمون بھی اس موضوع پر حقیقت افروز مضمون تھا۔ جو اس کے منظر اور پس منظر کے ساتھ اس کے فقہی مسائل پر جامع مانع بحث پر مبنی تھا۔ اسی طرح آپؒ کے دیگر مضامین اور ذاتی و حکمانہ خط و کتابت آپؒ کی قدرتِ کلام کی شاہکار اور دانش و حکمت سے لبریز خزانہ ہے۔

جہاں تک خود تحریر کردہ تصنیفات کا تعلق ہے، حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے بہت زیادہ کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ ہاں البتّہ آپؒ نے تصنیفات چھوڑی بہت ہیں اور ان کی تعداد بڑھتی بھی رہے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپؒ کے خطابات اور لیکچرز وغیرہ ضبط تحریر میں لائے جاتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ جو کتب آپؒ نے خلافت سے پہلے تصنیف فرمائیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

اردو

1. مذہب کے نام پر خون(Murder in the Name of Allah)
2. ورزش کے زینے(Steps of Exercize)
3. احمدیت نے دنیا کو کیا دیا؟
4. آیتِ خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کا مفہوم اور جماعت احمدیہ کا مسلک
5. پیشگوئی مصلحِ موعودؓ
6. جماعت احمدیہ اور اسرائیلی حکومت
7. سوانح فضلِ عمرؓ (حصّہ اوّل)
8. سوانح فضلِ عمرؓ (حصّہ دوم)
9. ”ربوہ سے تل ابیب تک“ پر تبصرہ
10. وصال ابن مریمؑ
11. عذاب الٰہی۔ حوادث طبعی یا عذاب الٰہی

خلافت کے بعد اردو میں آپؒ کی صرف دو تصنیفات ہیں جو آپؒ نے تحریر فرمائیں۔ یعنی:

1. قرآن کریم کا اردو ترجمہ
2. ہومیو پیتھی۔Homoeopathy

خلافت کے بعد آپؒ کے خطبات و خطابات جو مستند کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

1. عدل، احسان اور ایتآء ذی القربیٰ۔

Absolute Justice, Kindness and Kinship

2. زھق الباطل۔ عربی ترجمہ: زَھَقَ البَاطِلِ۔

3. 25/ جنوری 1985ء تا 13/ مئی 1985ء خطبات بجواب "قادیانیت، اسلام کے لئے سنگین خطرہ (قرطاسِ ابیض)"۔ (اس کتاب میں حسبِ ذیل خطبات شامل ہیں جو الگ الگ انگلش تراجم میں شائع شدہ ہیں)

I. کذب و افتراء کی دالآزار مہمّ اور اس کا پس منظر

A Deplorable Scheme of Falsification and Accusation

II. خود کاشتہ پودا۔ تاریخی واقعات کے آئینہ میں

Was Ahmadiyya Muslaim Jama'at Planted by The British?

III. ہندوستان میں انگریزوں کے مفادات اور ان کے محافظ

The British Interest in India and Their Real Gardian

IV. اسلام کا نظریۂ جہاد اور جماعت احمدیہ

The True Islamic Concept of Jehad

V. مسلمانانِ ہند کا قومی تحفّظ اور جماعت احمدیہ

The National Securityof Indian Muslims

VI. مسلمانانِ ہند کے مفادات کا تحفّظ اور جماعت احمدیہ کی عظیم الشان قربانیاں

VII. کشمیر اور فلسطین کی تحریک آزادی اور جماعت احمدیہ کی عظیم الشّان خدمات

Ahmadiyya Muslim Jama'at and Independance of Kashmir and Palestine

VIII. مسلمانان فلسطین کا المیہ اور جمات احمدیہ کی خدمات جلیلہ

Ahmadiyya Muslim Jama'at and the Palestinian Muslims

IX. عُلَمَاءُ هُمْ۔ امّتِ مسلمہ کے لئے لمحہ ٔفکریہ

Their Ulema

X. حضرت بانیٔ جماعت احمدیہ پر چند اعتراضات کے مدلّل اور مسکِت جواب

The Founder of the Ahmadiyya Muslim Jama'at

XI. حضرت مسیح موعود مہدی آخر الزمان کے دعاوی اور بزرگان سلفِ صالحین کی قولی شہادت

Claims of the Promised Messiah (as)

XII. عرفان ختم نبوّت

The Insight into the Concept of Khatm-e- Nabuwwat

XIII. پُر حکمت تاویلات پر ظاہر پرستوں کا مضحکہ خیز ردّ عمل اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا پُر شوکت کلام، مسلمان مشاہیر کی نظر میں

Majestic Writings of the Promised Messiah

XIV. انتہائی ظالمانہ تکفیر و تکذیب کے مقابلہ میں حضرت بانیٔ سلسلہ کا صبر و تحمّل، ہمّت و حوصلہ اور ابلاغ حق

Exteme Lies and Verdicts of Disbelief Against the Founder of the Ahmadiyya Muslim Jama'at

XV. اسلام کی عالمگیر روحانی ترقی کا عظیم الشّان منصوبہ اسے سازش کا نام دینا اسلام دشمنی کے مترادف ہے

The Supreme Plan for the Universal Regeneration of Islam

XVI. مسلمانوں کے باہمی اختلافات۔ بگڑے ہوئے عقائد اور حکم وعدل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی عظیم الشان خدمات

The Magnificent Services of The Promised Messiah

XVII. عددی اکثریت کا غیر شرعی فیصلہ اور احمدیت کی عظیم الشّان فتح

A Great Victory Ahmadiyyat

XVIII. ایک نشان۔ ایک انتباہ

An Admonitory Sign

4. ذوق عبادت اور آداب دعا

5. خلیج کا بحران اور نظام جہان نو۔ انگریزی:

The Gulf Crices and The New World Order

6. عربی: ''کارثۃ الخلیج والنظام العالمی الجدید''

7. چوہدری ظفر اللہ خانؓ، کلمۃ اللہ۔ (خطبہ جمعہ)

A Sign of Allah, Chaudhry Muhammad Zafrulla Khan

8. اسلام میں مرتد کی سزا (خطاب جلسہ سالانہ)

The Truth about the Alleged Punishment for Apostasy in Islam

9. تدریس نماز۔ اردو کلاس میں تدریس نماز

10. حوّا کی بیٹیاں اور جنّت نظیر معاشرہ

11. مجالس عرفان

12. خطباتِ طاہر

13. خطاباتِ طاہرؒ

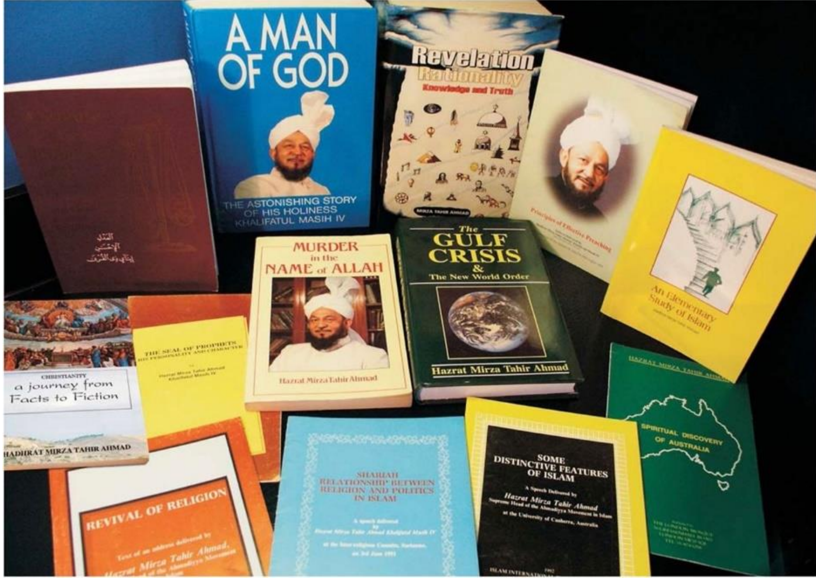
14. مشعلِ راہ۔ (خدّام الاحمدیہ سے متعلّق خطبات و تقاریر کا مجموعہ)

15. اَلْاَزْهَارُ لِذَوَاتِ الْخِمَارِ۔ (اوڑھنی والیوں کے لئے پھول) جلد دوم۔ (لجنہ اماء اللہ سے متعلق خطبات و خطابات)

16. تحریک وقف نَو

17. ذوق عبادت اور آداب دعا

18. شہدائے احمدیت۔(آغاز تا عہد خلافت رابعہ)



خلافت کے زمانہ میں آپؒ کی چار تصنیفات انگلش میں ہیں

1. Rationality, Knowledge and Truth Revelation

الہام، عقل، علم اور سچائی

2. Christianity: A Journey from Facts to Fiction

مسیحیّت، ایک سفر حقائق سے فسانہ تک۔

3. Islam's Response to Contemporary Issues

اسلام اور عصرِ حاضر کے مسائل کا حل

4. With Love to the Muslim Nation

بعض خطابات جو کتابی شکل میں شائع ہوئے

1. Some Distinctive Features of Islam
2. The Seal of Prophets, His Personality and Character
3. The Philosophy of Revival of Religion
4. Islam, A Discourse on the Elementary and Fundamental teaching
5. Shariah Relationship Between Religion and Politics in Islam
6. Universal Moral Values, Politics and World Peace

(ہادی علی چوہدری۔نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ یکم مارچ 2023ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ

ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب

قسط 3 اور 4

تحقیق اور ترتیب مواد

خاکسار نے متعدد مرتبہ خود مشاہدہ کیا ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ تحقیق و تدقیق کے دوران بعض اوقات زیر تحقیق مسئلہ پر جمع شدہ مواد کو ابتداء میں بکھیر دیتے تھے۔ پھر اس کے ہر حصّے کو جدا جدا کر کے اس کی گہرائی اور تفصیل کو پرکھ کر پھر اسے اپنی مطلوبہ ترتیب کے ساتھ مجتمع فرماتے تھے۔ شروع میں محسوس ہوتا کہ ہر پہلو الگ الگ سا ہے۔ لیکن ذرا آگے بڑھنے سے واضح ہوتا چلا جاتا کہ تسلسل بھی اس طرح قائم ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہر سمت سے دلیل منضبط ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ بغیر کوئی پہلو تشنہ چھوڑے اور ترتیب قربان کئے، غالب منطق، بالغ دلیل اور واضح مفہوم کے ساتھ اصل اور مرکزی مدّعا روشن ہو جاتا ہے۔

دیگر تصنیفات کی طرح جلسہ سالانہ 1985ء کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کا خطاب بھی جو بر موضوع "عرفان ختم نبوّت" جو کتابی شکل میں بھی شائع شدہ ہے، آپؒ کی اسی طرزِ تحقیق و ترتیب کا آئینہ دار ہے۔ یوں تو جماعت میں ہر دور کے لٹریچر میں مسئلہ ختم نبوّت پر بڑی

جامع اور مبسوط بحثیں کی گئی ہیں۔ اس مسئلے پر گہرے، دقیق اور ناقابل ردّ دلائل سے لدے ہوئے مضامین، کتب اور رسائل موجود ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ آپؒ نے اپنے مذکورہ بالا خطاب میں اس مسئلہ کے مختلف زاویوں اور پہلوؤں کو ہر جہت میں رکھ کر اور سننے والے یا پڑھنے والے کو ہر سمت میں لے جا کر ہر پُر حقیقت منظر دکھایا ہے اور پھر اسے آخر میں اپنے ساتھ لا کر حقیقی نتیجہ تک پہنچایا ہے۔ علم و تحقیق کا یہ ایک اچھوتا رہنما انداز ہے جو آپؒ کو جناب الٰہی سے عطا ہوا ہے۔ اس یکتا اسلوب کی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ آپؒ نے سامع یا قاری کو اِدھر اُدھر لیجانے اور واپس نتیجہ تک لانے میں اس کے فکر اور سوچ کو نہ ذرّہ بھر بکھرنے دیا ہے نہ الجھنے۔

حضورؒ کی تحقیق و تصنیف کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ آپؒ خود کو کسی مصنّف کے رجحانات و نظریات وغیرہ سے کلّیۃً آزاد کر کے دلائل و حقائق کو اپنے اُس فہم و ادراک اور فراست کے ترازو میں تولتے تھے جس کے دھاگے علم و عرفان الٰہی سے منسلک تھے۔ لہٰذا اس تحقیق کا رُخ ہمیشہ درست سمت میں ٹھوس منطقی نتیجہ تک پہنچتا تھا۔ یہ نتیجہ خواہ مروّجہ خیالات سے مختلف یا مخالف بھی ہوتا تو بھی صحیح ہوتا تھا۔ یعنی آپؒ ایک فرستادہ اور کامل ماہر فن ہونے کی وجہ سے اس کے جملہ زاویوں پر جامع نظر رکھتے تھے۔

حضورؒ تحقیق و تدقیق کو اس کی آخری حدوں کو چھوتے تھے۔ آپؒ بلا تصدیق نقل در نقل یا حوالہ در حوالہ اقتباس درج کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ گو آپؒ کی ابتدائی کتب میں بھی کسی ایک دو جگہ بامرِ مجبوری ایسا ہوا ہے مگر آپؒ فرماتے تھے کہ درحقیقت یہ اہل علم کا اسلوب نہیں۔ اصل کتاب سے براہِ راست اصل عبارت درج کرنی چاہئے۔

آپؒ اکثر اپنے خداداد علم اور عرفان کی بناء پر بات شروع ہوتے ہی اس کی کنہ کو پا لیتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات مواد اور تحقیق کے موجود ہوتے ہوئے بھی اپنا ایسا الگ مؤقف اختیار فرماتے تھے کہ جملہ مواد اس زاویۂ مؤقف کی تائید کرنے لگتا تھا۔ آیت کریمہ ''تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ....'' (البقرہ:254) میں مِنْهُمْ کے بعد وقف کی

صورت میں انبیاءؑ کی ایک دوسرے سے جزوی اور کلّی فضیلتوں اور امتیازات کا ذکر اور ''وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ'' (النساء:160) میں اہل کتاب کے ہر فرقہ یا فریق میں سے حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کی حقیقت کا بیان نیز ''فَعَزَّزۡنَا بِثَالِثٍ'' (یٰسٓ:51) میں مذکور ثالث نبی کے بارہ میں مؤقف، اسی طرح فرعون مصر کا غرقابی کے بعد زندہ رہنا اور ایک عرصے تک حکومت کرنا، نیز حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگی و شہادت کی بحث وغیرہ اور دیگر کئی امور ہیں جن میں آپؒ کا مؤقف نور عرفان پر قائم اور ممتاز ہے۔ یہ بحثیں آپؒ کی قرآن کلاسوں اور دروس القرآن کی کلاسوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مذاہب اسلام کا علم تو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے آپؒ کو انتہاء کا عطا فرمایا تھا۔ آپؒ نے مختلف اسلامی مکاتب فکر کا بھی خوب مطالعہ کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہبِ عالم، مثلاً یہودیت، عیسائیت، ہندو مت، بدھ مت، کنفیوشن ازم، تاؤ ازم، شینٹو ازم، رزتشتی مذہب، سکھ ازم اور قدیم ابورجنی تعلیمات وغیرہ کا بھی آپؒ نے مطالعہ کیا۔ اسی طرح کمیونزم اور سوشلزم نیز ان کی مختلف ذیلی تحریکات وغیرہ کے فلسفے کو بھی تفصیل کے ساتھ پرکھا۔ علم الادیان کے ساتھ علم الابدان کے جتنے بھی شعبے آپؒ کے لئے ممکن ہوئے، آپؒ نے مطالعہ کئے۔ مثلاً سائنس کے مختلف شعبے، سیاستِ ملکی و عالمی، تاریخِ اُمم، جغرافیہ و جغرافیائی تغیّرات، موسموں کے اثرات و تغیّر و تبدّل، مشرقی و مغربی اور یونانی فلسفہ وغیرہ، علم نفسیات، علم و عملِ تنویم یا ہپناٹزم، علم اشراق یا ٹیلی پیتھی، تحت الشعور اور لاشعور کے مختلف تجارب، علم فلکیات کے متعدد شعبے اور لامحدود وسعتوں کا ادراک، ابتدائے حیات و ارتقائے حیات کے فلسفے اور علوم، ارضی اور غیر ارضی حیات و مخلوقات، عضویاتی نظام اور اس کا ارتقاء، سمتوں کی حقیقت، علم غیب کی حقیقت، طوفانوں، تباہیوں اور امراض وغیرہ کی وجوہات، زمینی مخلوق کا مستقبل، وغیرہ وغیرہ بے شمار علوم پر آپؒ کا علم انتہائی جامع تھا۔ ان کے ساتھ قرآن کریم کا تجزیہ یا اس کی تصدیق و حکمیت آپؒ کے علم کو حتمیّت عطا کرتی تھی اور آپؒ کے بیان کو سچا اور قطعی بناتی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح آپؒ کے منصب

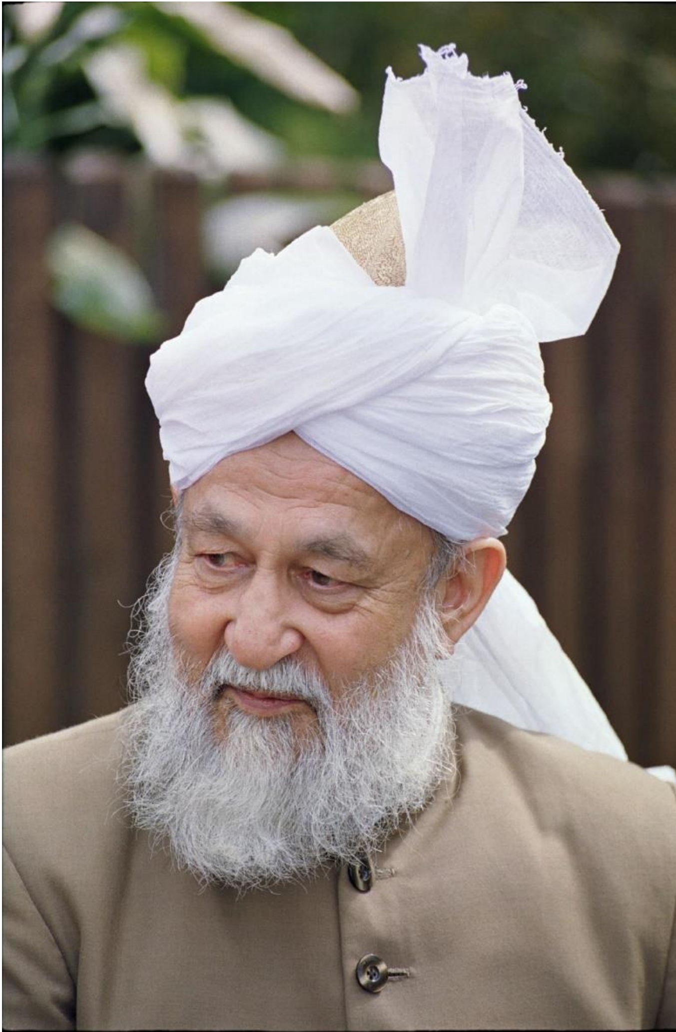
خلافت کا دائرہ پورے عالم پر محیط تھا اسی طرح آپؒ کا علم بھی افق تا افق تھا تو اس میں ایک ذرّہ بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ آپؒ کی جملہ تصنیفات عموماً اور معرکہ آراء تصنیف "الہام، عقل، علم اور سچائی" خصوصاً اس پر شاہدِ ناطق ہیں۔ آپؒ کے علم کی وسعتوں اور ذخائر علوم پر دسترس کا ذکر کرتے ہوئے مشہور ماہر امراض قلب مکرّم ڈاکٹر سیّد نور الحسن نوری صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اب آپ اسی سے اندازہ لگالیں جو اگر ظاہری طور پر دیکھا جائے تو خاکسار نے کارڈیالوجی کی لندن میں تعلیم حاصل کی اس پر بہت زیادہ کام بھی کیا۔ لیکن اس موضوع پر حضورؒ سے بات ہوتی تو حضورؒ اس تفصیل سے اس موضوع پر بات کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ خصوصاً میری فیلڈ اینجیوگرافی اور اینجیوپلاسٹی ہے۔ بارہ تیرہ سال پہلے کی بات ہے۔ جب اینجیو پلاسٹی بالکل آغاز پر تھی تو حضورؒ نے اس کے بارہ میں مجھے روشنی دی تو میرا interest اس بارہ میں شروع ہوا۔"

ایسا ہمیشہ ہوتا تھا کہ آپؒ سے پہلی مرتبہ ملاقات کرنے والے غیر از جماعت خواص کا خیال ہوتا کہ یہ کوئی عام مذہبی لیڈر ہے جو ایک مخصوص ذہن و خیال، محدود علم و فکر، عالمی تقاضوں اور حالات سے لاتعلق اور بے خبر ہے۔ لیکن جب گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا تو حضورؒ ان کو انہی کے مخصوص متعلّقہ مضمون کے بارہ میں اتنی گہرائی میں جاکر بتاتے کہ وہ حیران رہ جاتے کہ اس شخص کو اتنا علم کہاں سے آیا ہے اور ملاقات کے بعد اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کرتے کہ ہمیں اپنے مضمون پر خود اتنا عبور نہیں تھا جتنا آپؒ نے اس کے بارے میں بتایا ہے۔

جب حضورؒ کے علمی تفوّق اور رسائی پر نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ آج کی دنیا میں علم و عرفان کا ایک سرچشمہ تھے۔ آپؒ کے دینی اور روحانی علم کے بارے میں ایک عالم گواہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں علوم ظاہری و باطنی کا ایک خزانہ تھے۔ مگر ہر طبقۂ فکر کے لوگوں کے لئے یہ بات نہایت حیران کن تھی کہ مروّجہ دنیاوی علوم میں بلامبالغہ کوئی ایسا میدان، ایسا موضوع یا مضمون نہیں تھا جس میں آپؒ کو سیر حاصل دسترس نہ تھی۔ مثلاً ٹیلی ویژن اور سیٹلائٹ انڈسٹری خالصۃً

انجنئیرنگ سے متعلق ایک سائنس ہے۔ آپؒ اس کے تمام پہلوؤں کو بھی تفصیل اور گہرائی میں سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہایت ٹیکنیکل معاملات میں بھی آپؒ ماہرین فنّ سے ہمیشہ دو قدم آگے ہی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؒ نے ڈش انٹینا پر سیٹلائٹ سگنل کو ریسیو کرنے کے مکمل تکنیکی عمل اور Parabola کے مفہوم کو با قاعدہ خاکہ بنا کر کام کرنے والوں کو اس طرح سمجھایا جیسے کوئی اعلیٰ ڈگری یافتہ ماہر انجینئر سمجھا سکتا ہے۔



بارہا ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی فن یا علم کا کوئی ماہر کوئی پیچیدہ معاملہ لے کر بڑی مفصّل اور مکمّل تیاری کے ساتھ حضورؒ کی خدمت میں پیش ہوا۔ ظاہر ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے کم مائیگی کا یہ خیال بھی ساتھ ہوتا تھا کہ شاید مدّعا صحیح بیان نہ ہو پائے۔ مگر حضورؒ نے ابتدائی چند الفاظ میں ہی سارے معاملے کو یوں بھانپ لیا کہ حاصل مطلب نکتہ خود ہی بیان فرما دیا اور بغیر کسی مزید تفصیل کے یوں ہدایت فرمائی کہ اس مسئلے کا اس سے زیادہ مناسب دیگر حل ممکن نہ تھا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ آپؒ اپنے دور کے منفرد صاحب طرز ادیب و مصنف تھے۔ آپؒ کا قلم اردو ادب اور اس کے محاوروں کے گہرے رازوں سے شناسا اور حق و صداقت کی روشنائی سے منوّر تھا۔ آپؒ سچے تھے، جو لکھتے تھے، سچ لکھتے تھے۔ اس کے عقب میں جو سچا جذبہ کار فرما تھا، آپؒ نے ایک مرتبہ اس کا اظہار یوں فرمایا کہ

”بچپن میں جب حضرت مسیح موعودؑ کا لٹریچر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دفاع میں پڑھا کرتا تھا تو میں خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرتا تھا کہ اے خدا! جس طرح حضرت مسیح موعودؑ اپنے آقا اور مطاع حضرت محمدؐ کی عزت کی حفاظت میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں مجھے بھی یہ توفیق دے کہ میں حضرت مسیح موعودؑ کے دفاع میں اسی طرح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری دعاؤں کو قبول کیا اور میں جو بھی کہتا ہوں آپ کی مدافعت اور دفاع میں کہتا ہوں۔“

(الفضل انٹرنیشنل 29/ اگست تا 4/ ستمبر 1997ء)

خدمتِ اسلام کے لئے مضطرب آرزؤں اور سیماب پا خواہشوں سے بھرے ہوئے اس نابغۂ روزگار برگزیدہ ادیب کی یہ تحریریں ملاحظہ ہوں۔ ان پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن جب آپ یہ تحریریں پڑھیں گے تو آپ یہ حقیقت تسلیم کئے بغیر نہیں رہیں گے کہ جہاں آپؒ کا قلم ہوس اقتدار و اختیار سلطنت میں غرق ایک اندھے لکھاری کی زہرناک تحریروں کو عقلی و نقلی دلائل نیز منطق کے موافق و مخالف دھاروں سے کاٹتا چلا جاتا ہے وہاں وہ بار بار اپنے محسن آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جذبات عشق و غیرت میں بھی ڈوب ڈوب جاتا

ہے اور درد نہاں کی روشنائی سے لبریز ہو کر سینۂ قرطاس پر حقیقت و عرفان کے وہ موتی بکھیر تا ہے کہ جنہیں ابدی سچائیاں اور لازوال حقیقتیں چوم چوم لیتی ہیں۔ مثلاً سچائی یہ ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ نے کبھی اشاعت اسلام کی غرض سے تلوار نہیں اُٹھائی اور آپؐ کی کوئی ایک جنگ بھی جارحانہ نہیں تھی۔ چنانچہ اسلام پھیلا ہے تو محض آپؐ کی روحانی اور اخلاقی قوّتوں سے، آپؐ کی پاکیزہ سیرت کے جلووں سے، آپؐ کی پاک تعلیم کے حسن سے، آپؐ کے پیغام کی غالب سچّائی سے اور در حقیقت اللہ میں فنا ہو کر کی گئی اندھیری راتوں کی عرش بوس دعاؤں سے۔ مگر جب اس سچائی کو ایک مسلمان مصنّف ہی اپنے ظالمانہ تبر سے کاٹنا چاہتا ہے تو آپؒ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی حفاظت کے لئے ایک غیرت مند بیتاب دل کے ساتھ اپنے آقا مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ڈوبے ہوئے قلم سے دفاع کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہوتے ہیں کہ:

”ظلم کی انتہاء یہ ہے کہ بعض مسلمان ”رہنما“ جبر و تشدّد کے نظریہ کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ ہمارے پاک آقاؐ کو بھی اُس میں ملوّث کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُسؐ کے دین اور اُسؐ کی قوّت قدسیہ کو بھی اپنے کھوکھلے دلائل اور کِرم خوردہ قوّتوں کی طرح ایسا کمزور جانتے ہیں کہ گویا اگر تلوار اُس کے قبضۂ قدرت میں نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی وہ عظیم رُوحانی تبدیلی پیدا نہ کر سکتا جو عرب سے پھوٹنے والے اُس روحانیت کے سرچشمہ نے چند سالوں میں کر کے دکھادی تھی۔ اُن کے نزدیک اُس مظلوم نبیؐ کی دفاعی جنگیں محض اپنے مذہب کو پھیلانے کے لئے ایک جارحانہ اقدام تھا اور اُس کی مکّی زندگی کا دَور محض ایک ناطاقتی کی دلیل تھی۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے امیر مولوی مودودی نہایت واشگاف الفاظ میں رقمطراز ہیں:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 13 برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے وعظ و تلقین کا جو مؤثر انداز ہو سکتا تھا اُسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے، واضح حُجّتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیر العقول معجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو

حق کے اظہار و اثبات کے لئے مفید ہو سکتا تھا لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا........ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی.........تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادّے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اس سُرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہو گئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے اُن پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔"

("الجہاد فی الاسلام" باب چہارم: اشاعتِ اسلام اور تلوار صفحہ 174-173 ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور)

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ یعنی وہ گندہ اور سخت بہیمانہ الزام جو اسلام کے اشدّ ترین متعصب دشمنوں کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات پر لگایا جاتا تھا جسے یورپ کے یاوہ گو مستشرقین گزشتہ صدی تک عیسائی دنیا میں اُچھالتے رہے اور اسلام سے دلوں کو متنفّر کرتے رہے وہ آج خود ایک مسلمان "رہنما" کی طرف سے اس مقدّس رسولؐ کی پاک ذات پر لگایا جا رہا ہے ایک ایسے راہنما کی طرف سے جسے "مزاج شناس رسولؐ" ہونے کا دعویٰ ہے۔ گو الفاظ کو میٹھا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، گو تلوار کی اِس مزعومہ فتح کو پُر شوکت بنا کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر گولی وہی کڑوی اور ناپاک اور زہریلی گولی ہے جو اسلام کے دشمنوں کی طرف سے رسول اللہؐ کی طرف پھینکی جاتی تھی۔ یہ وہی پتھر ہے جو اس سے پہلے جارجؔ سیل اور سمتھؔ اور ڈوزیؔ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پھینکا تھا اور وہی الزام ہے جو مسٹر گاندھی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس وقت لگایا تھا جب وہ اسلام کی تعلیم سے ابھی پوری طرح آشنا نہیں تھے اور محض

دشمنانِ اسلام کی کہی ہوئی باتوں کو سُن کر یہ تأثر قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کے الفاظ میں:

''اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کُن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔''

اور ڈوزی کہتا ہے کہ:

''محمدؐ کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔''

اور سمتھ کو دعویٰ ہے کہ جرنیلوں کا کیا سوال، خود:

''آپؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر مختلف اقوام کے پاس جاتے ہیں۔''

اور جارج سیل یہ فیصلہ دیتا ہے کہ:

''جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنے اور بزورِ شمشیر بُت پرستی مٹا کر دین حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مل گئی ہے۔''

اِن سب دشمنانِ اسلام کی آوازوں کو سنیے اور پھر مولوی مودودی کی مندرجہ بالا عبارت کا مطالعہ کیجئے۔ کیا یہ بعینہٖ وہی الزام نہیں جو اِس سے پہلے بیسیوں دشمنان اسلام نے رسولِ معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر لگایا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اس سے بھی زیادہ آپؐ کی قوّتِ قدسیہ پر حملہ کرنے والا۔ آپ دشمنانِ اسلام کی عبارتیں پڑھ کر دیکھ لیجئے کہیں بھی آپ کو آنحضرت اکی قوّتِ قدسیہ کی مزعومہ کمزوری اور معجزات کی ناطاقتی کا ایسا ہولناک نقشہ نظر نہیں آئے گا جیسا مولوی مودودی نے کھینچا ہے۔ یعنی آپؐ کی مسلسل تیرہ سال کی دعوتِ اسلام تو دلوں کو فتح کرنے سے قاصر رہی مگر تلوار اور جبروت نے دلوں کو فتح کر لیا۔ وعظ و تلقین کے مؤثر سے مؤثر انداز تو صحرائی ہواؤں کی نذر ہو گئے مگر نیزوں کی اَنی نے دلوں کی گہرائیوں تک اسلام پہنچا دیا۔ آپؐ کے ''مضبوط دلائل'' تو عقلِ انسانی میں جاگزیں نہ ہو سکے مگر گُرزوں کی مار خَودوں کو توڑ کر اُن کی عقلوں کو قائل کر گئی۔ واضح بحثیں اُن کی قوّت استدلال کو متاثر نہ کر سکیں مگر گھوڑوں

کی ٹاپوں نے ان کو اسلام کی صداقتوں کے تمام راز سمجھا دیئے۔ فصاحت بلاغت بے کار گئی اور زور خطابت دلوں کو اِس درجہ گرما نہ سکا کہ اسلام کا نور اُن کے دلوں میں چمک اٹھتا حتّٰی کہ خود عرش کے خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والے محیّر العقول مُعجزے بھی خائب و خاسر رہے اور ایک ادنیٰ سی پاک تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکے لیکن.........."جب داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی.........."اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ کِس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تصوّر اور کیسے تحقیر آمیز الفاظ ہیں کہ جن کو پڑھ کر رونا آتا ہے کہ یہ ایک "اسلامی راہنما" کے قلم سے نکلے ہیں جو رسولؐ کی محبت کا دعویدار ہے۔ مولوی کے اِن الفاظ کو پڑھیئے اور "میزان الحق" کے کینہ توز مصنّف پادری فنڈرؔ کے ان الفاظ کا مطالعہ کیجئے:

"اب حضرت محمدؐ تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے...... لہٰذا اب سے آنحضرتؐ "النّبی بالسیف" کہلائے یعنی نبیٔ تیغ زن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی۔"

(میزان الحق صفحہ 468)

"اگر ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہو گا کہ اب وہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبہ کے موضوع و مقبول اخلاقی قواعد کی پابندی اُن کے لئے ضروری نہ تھی۔ اب خدا اُن سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں۔"

(میزان الحق صفحہ 499)

اور اس کے بعد یہ مصنف مسیحؑ کی مظلومی کا بڑے فخر سے نعوذ باللہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزعومہ جبر کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"آپ کو خداوند یسوع مسیح کلمۃ اللہ اور حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بن عبد اللہ میں سے ایک کو پسند کرنا ہے۔ یا تو اُس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اُس کو جو "النّبی بالسیف" کہلاتا ہے۔"

(تتمہ، میزان الحق)

پھر مولوی مودودیؔ کی تائید میں ایک اور اسلام دشمن مسٹر ہنریؔ کوپی کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھیئے:

''اور اپنی نبوّت کے تیرھویں سال آپ نے اِس امر کا اظہار کیا کہ خدا نے مجھ کو نہ صرف بغرض مدافعت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ اپنا دین بزور شمشیر پھیلانے کی بھی اجازت دی ہے۔''

(اہلِ عرب کی سپین کی تاریخ از ہنریکوپی جلد اوّل صفحہ 39 مطبوعہ بوسٹن۔ماخوذ از ''مقدمہ تحقیق الجہاد''صفحہ 31)

اور ڈاکٹر اے سپر نگر کے یہ الفاظ پڑھیے جو مولوی مودودی کی ہم خیالی میں اِس رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''اب پیغمبر (صلعم) نے فتنہ کے دفع کرنے کے لئے اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا قانون خدا کے نام سے شائع کیا اور اس وقت سے یہ قاعدہ آپ کے (نعوذ باللہ) خونی مذہب کا نعرۂ جنگ ہو گیا۔''

وہ دشمنانِ اسلام جو آنحضورؐ کے شدید ترین معاندین میں شمار ہوتے ہیں۔ بُغض و عناد سے جن کے سینے کھولتے ہیں۔جو نفرت کی آگ میں جلتے ہیں اگر وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جبر کا الزام لگائیں تو تعجب نہیں۔ غم تو بہت ہوتا ہے مگر تعجب نہیں۔ ہاں تعجب ان پر ہے اور حیف اُن پر جو اس معصوم اور مظلوم رسولؐ کی پیروی کا دَم بھر کر بھی آپؐ کی مقدس ذات پر بربریت کا الزام لگانے کی جسارت کرتے ہیں۔

مولوی مودودی کے نزدیک نہ کبھی پہلے اسلام میں یہ طاقت تھی کہ محض اپنے حسن و جمال سے تلوار کی مدد کے بغیر دلوں کو فتح کر سکے اور نہ آج یہ طاقت ہے۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''حقیقت الجہاد'' میں رقمطراز ہیں:

''کوئی ایک مملکت بھی اپنے اصول و مَسلک کے مطابق پوری طرح عمل نہیں کر سکتی جب تک کہ ہمسایہ ملک میں بھی وہی اصول و مَسلک نہ رائج ہو جائے۔ لہٰذا مسلم پارٹی کے لئے اصلاح

عمومی اور تحفّظ خودی دونوں کی خاطر یہ ناگزیر ہے کہ کسی ایک خطّہ میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ جہاں تک اس کی قوّتیں ساتھ دیں اس نظام کو تمام اطراف میں وسیع کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک طرف اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلائے گی اور تمام ممالک کے باشندوں کو دعوت دے گی کہ اس مَسلک کو قبول کریں جس میں اُن کے لئے حقیقی فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف اگر اس میں طاقت ہو گی وہ لڑ کر غیر اسلامی حکومتوں کو مٹا دے گی اور اُن کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرے گی۔“

اس عبارت کو جناب مولوی صاحب کی پہلی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے بے اختیار گاندھی جی کی یہ رائے ذہن میں اُبھر آتی ہے کہ:

”اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے کہ اُس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔“

اور آنحضرتؐ اس مصنوعی خیالی تصویر کی طرف دھیان منتقل ہو جاتا ہے جو واشنگٹن اِرونگ نے اپنی مصنّفہ ”سیرتِ محمد“ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے ہی صفحہ پر چسپاں کی ہے اور جس میں آنحضرت اکو ایک ہاتھ میں تلوار لئے اور ایک ہاتھ میں قرآن لئے ہوئے دکھایا گیا ہے اور معاً دل میں یہ یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ مولوی کے نزدیک بھی اسلام اور اس کے مقدس رسولؐ کا تصوّر واشنگٹن اِرونگ کے تصور سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

پس ایک طرف تو یہ مسلمان ”عالم“ ہے کہ دنیا کے معصوم ترین نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اشد ترین مخالفین کا ہم نوا ہو کر ظلم اور تعدّی اور جبر اور بغاوت کے الزام لگا رہا ہے اور دوسری طرف ہمیں بے شمار ایسے انصاف پسند غیر مسلم مفکرین کا گروہ نظر آتا ہے جو باوجود شدید اختلاف کے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہر گز تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اپنے ظاہری و باطنی حسن اور عظیم اخلاقی قوّت کے زور سے دلوں پر فتحیاب ہوا۔ چنانچہ مولوی اور معاندین اسلام کے محرّرہ بالا اقتباسات کے بعد بے محل نہ ہو گا کہ ہم بعض انصاف پسند غیر

مسلموں کی رائے بھی پیش کر دیں۔ یہ سب کے سب اسلام کے حامی و مدّاح نہیں ہیں بلکہ بعض ایسے بھی ہیں کہ خفیف سے خفیف موقع سے فائدہ اُٹھا کر بھی اسلام پر حملہ کرنے سے نہیں چُوکے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دفاعی جنگوں پر گہری تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد اُنہیں بے اختیار یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:

"اکثر متعصب مخالفینِ اسلام خصوصاً گمراہ کُن پروپیگنڈا کرنے اور ملک میں آتشِ فتنہ و فساد کے بھڑکانے والے کہا کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ جا کر طاقت و قوّت حاصل کر کے اپنی اِس بناوٹی تعلیم رحم و مروّت کو باقی نہ رکھ سکے اپنی زندگی کے اہم مقصود (طلب دنیا حکومت و مرتبہ، مال و دولت وغیرہ) کے حصول کے لئے بڑے زور کے ساتھ تلوار و قوّت کا استعمال کیا بلکہ ایک خونی پیغمبر بن کر دنیا میں تباہی و بربادی مچائی اور اپنے اس بناوٹی صبر و ضبط کے معیار سے گر گئے۔ لیکن یہ ان کو تاہ بین مخالفوں کی (جن کو خواہ مخواہ کا بُغض اسلام اور مسلمانوں سے ہے) تنگ نظری اور پکشپات رُوپی اگیان (جانبداری، طرفداری۔ ناقل) کا پردہ جو اُن کی نگاہوں پر پڑا ہوا ہے اور بجائے نور کے نار۔ حُسن کے قبح۔ اچھائی کے بُرائی ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہر ایک خوبی کے اعلیٰ مرتبہ و تعلیم کو ایسی بُری شکل و صورت میں پیش کرتے ہیں جن سے ان کی بد باطنی اور سیاہ قلبی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔"

(دنیا کا ہادیٔ اعظم غیروں کی نظر میں، صفحہ 57)

یہ اِقتباس ایک غیر مسلم مقرر جناب پنڈت گیا نیندر صاحب دیو شرما شاستری کی ایک تقریر سے لیا گیا ہے جو انہوں نے 1928ء میں رسول اللہؐ کی سیرت پر گورکھ پور میں فرمائی تھی۔ کچھ آگے چل کر یہی پنڈت صاحبِ اسلام کی فیصلہ کُن طاقت کے بارہ میں اپنی تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"مخالفین اندھے ہیں۔ اُن کو نظر نہیں آتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار رحم و مروّت تھی۔ دوستی اور درگزر تھی جو مخالفین پر پورے طور پر کارگر ہوتی اور اُن کے قلب کو پاک و صاف کر کے مثل آئینہ بنا دیتی جس کی کاٹ اِس مادی تلوار سے بڑی زبردست اور تیز ہوتی۔"

(دنیا کا ہادیٔ اعظم غیروں کی نظر میں، صفحہ 61)

اِس اقتباس کے بعد کسی رائے زنی یا موازنہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ مگر دل سے بے اختیار یہ آہ نکل جاتی ہے کہ کاش مولوی مودودی اپنے ''آقاؐ'' کے بارہ میں اتنے ہی انصاف سے کام لیتے جتنا کرشنؑ کے ایک غلام نے لیا ہے۔ ایک نہیں بلکہ بیسیوں حضرت کرشنؑ کے غلاموں نے جب تاریخِ اسلام پر غور کیا تو ہمارے آقاؐ کی بے پناہ قوّتِ حسن و احسان کو محسوس کیا اور یہ کہے بغیر اُن سے بن نہ پڑی کہ:

''لوگ کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا مگر ہم اُن کی اِس رائے سے موافقت کا اظہار نہیں کر سکتے کیونکہ زبردستی سے جو چیز پھیلائی جاتی ہے وہ جلدی ظالم سے واپس لے لی جاتی ہے (تعجب ہے کہ مولوی کی نظر ''مزاج شناسِ نبوّت'' انسانی فطرت کے اِس ظاہر و باہر نکتہ کو بھی پا نہ سکی۔ ناقل) اگر اسلام کی اشاعت ظلم کے ذریعہ ہوئی ہوتی تو آج اسلام کا نام نشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی پر ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر رُوحانی شکتی تھی۔ منش ماتر (بنی نوع انسان) کے لئے پریم تھا۔ اُس کے اندر محبت اور رحم کا پاک جذبہ کام کر رہا تھا۔ نیک خیالات اُس کی رہنمائی کرتے تھے۔''

(از قلم ایڈیٹر ''سَت اُپدیشن'' لاہور مؤرخہ 7/جولائی 1915ء ماخوذ از ''برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول، صفحہ 13-12)

مگر مولوی صاحب پھر بھی مُصِر ہیں کہ اسلام کی فیصلہ کن طاقت کا راز آپ کے روحانی اعجاز میں نہیں بلکہ تلوار میں مُضمر تھا۔ حَیف! صد حَیف!! کہ آپؐ کی مقدس زندگی کا وہ معجزہ جو ایک غالی آریہ کی نظر سے بھی اوجھل نہ رہ سکا مولوی کی ''پُر بصیرت آنکھ'' اُسے دیکھنے سے محروم رہ گئی۔ ''آریہ مسافر'' کی اسلام دشمنی سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ آریہ مذہب کا وہ ترجمان ہے جو ہمیشہ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ رہا مگر جب اس کے ایک مقالہ نویس نے رسول اللہؐ کے غلبہ کی وجوہ پر غور کیا تو تلوار کی قوت کے الزام کو ایک فرسودہ اور بے بنیاد اِتّہام کے طور پر ٹھکرا دیا اور آپ کے غلبہ کی وجہ محض یہ قرار دینے پر مجبور ہو گیا کہ آپ کی زندگی ایک مجسم معجزہ تھی چنانچہ وہ لکھتا ہے اور انسانی فطرت کی یہ کیسی سچّی اور پاک گواہی ہے کہ:

"وہ شخص جس نے قریش کو ایمان کا جام شہادت پلایا ایک معجزہ تھا.... اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک معجزہ نہ ہوتی تو کون ہم کو ولید (غالباً خالد بن ولیدؓ مراد ہیں۔ناقل) کی بے غرضانہ خدمات سے مستفید کرتا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جوش ایمان کا دریا موجزن کیا اور عرب کی جنگلی آبادی کو ایک واحد خدا کا پرستار بنایا۔"

("آریہ مسافر" اکتوبر 1913ء صفحہ 3-2 بحوالہ "برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول" صفحہ 24)

پھر لاہور میں ہونے والے آریہ سماج کے ایک جلسہ میں پروفیسر رام دیو صاحب سابق پروفیسر گوروکل کانگڑی و ایڈیٹر ویدک میگزین نے ہمارے آقا و مولا محمد عربیؐ پر لگائے جانے والے اس مکروہ اتہام کو غلط قرار دیتے ہوئے کہ آپؐ نے اسلام تلوار سے پھیلایا تھا ان الفاظ میں اپنی تحقیق کا اظہار کیا:

"لیکن مدینہ میں بیٹھے ہوئے محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن میں جادو کی بجلی بھر دی۔ وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے......اور یہ غلط ہے کہ اسلام محض تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اشاعت اسلام کے لئے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی گئی۔ اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھائے۔"

(اخبار "پرکاش" بحوالہ "برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول" صفحہ 11)

اس آخری فقرہ میں کیسی لازوال سچّائی بھری ہوئی ہے "اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھادے۔" ہمارے مقدّس آقا صلی اللہ علیہ وسلم پر جبر کا الزام لگانے والوں کے لئے لمحۂ فکریہ اور چیلنج ہے اور مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس نے مذہب کو پیدا کیا کہ جب سے سلسلۂ نبوّت جاری ہوا ہے نہ کبھی پہلے کسی جابر متشدّد نے اس چیلنج کا جواب دیا نہ آج دے سکتا ہے نہ کبھی آئندہ دے سکے گا اور ایک مودودی نہیں پچاس کروڑ مودودی بھی مِل کر کوشش کریں تب بھی ایک انسان کے دل سے بھی تلوار کی قوّت سے اُس کا مذہب نکال نہیں سکتے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ اس بات کے گواہ ہیں کہ اُن کے مخالفین کی طرف مذہب کو بزور تبدیل کرانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار مرتبہ تلوار اُٹھائی گئی مگر ہر بار خائب و خاسر رہی۔ وہ ہاتھ شل ہو گئے اور وہ

تلواریں ٹوٹ گئیں اور مذہب اُن کے سائے تلے بے خوف پھیلتا اور پھولتا اور پھلتا رہا۔ پھر ان سب نبیوں کے سردارؐ کے کب شایاں تھا کہ اس معصوم گروہ کے کامیاب طریقۂ تبلیغ کو چھوڑ کر ناکام ظالموں کا وطیرہ اختیار کرتے۔ نہیں۔ ایسا مت کہو کہ یہ میرے آقاؐ پر توڑے جانے والے سب ظلموں سے زیادہ ظلم ہے اور ایسا صریح ظلم ہے کہ غیر بھی بے اختیار پکار اُٹھے کہ نہیں ہوا۔ چنانچہ موسیو اوجین کلوفل نے آپؐ سے متعلق لکھا:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دنیا کو فتح کرنا اور اسلام کا بول بالا کرنا چاہا مگر غیر مذاہب والوں پر کسی قِسم کا جبر و ستم کرنا روا نہیں رکھا۔ اُن کو مذہب اور رائے کی آزادی عطاء کی اور اُن کے تمدّنی حقوق قائم رکھے۔"

("اسلام اور علمائے فرنگ" صفحہ 9 بحوالہ "برگزیدہ رسولؐ غیروں میں مقبول" صفحہ 11)

مسٹر گاندھی کو بھی جن کی فراست بڑی گہری تھی مزید تحقیق کے بعد آخر اپنی اُس رائے کو تبدیل کرنا پڑا جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ایک اشاعت میں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ:

"مَیں جوں جوں اِس حیرت انگیز مذہب کا مطالعہ کرتا ہوں حقیقت مجھ پر آشکارا ہوتی جاتی ہے کہ اسلام کی شوکت تلوار پر مبنی نہیں۔"

اور ڈاکٹر ڈی۔ ڈبلیو۔ لائٹز نے بھی خود قرآن ہی سے اِس الزام کی تردید میں ایک مضبوط استدلال کرتے ہوئے لکھا:

"فی الواقع اُن لوگوں کی تمام دلیلیں گِر جاتی ہیں جو محض اِس بات پر قائم ہیں کہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعہ سے اسلام کا پھیلانا تھا کیونکہ بخلاف اِس کے سورہ حج میں صاف لکھا ہے کہ "جہاد کا مدّعا مسجدوں اور گرجاؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور زاہدوں اور عابدوں (تپشیروں) کی خانقاہوں (تپسّیا شالاؤں) کو بربادی سے محفوظ رکھنا ہے۔"

(ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو" اکتوبر 1886ء)

پس تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کا الزام لگانے والوں سے مَیں خود قرآن ہی کے الفاظ میں پوچھتا ہوں اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۵﴾ (محمد:25) ”کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ یا دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں“!

مگر مولوی کو کون سمجھائے کہ وہ اس دعویٰ پر مُصِر ہیں اور ببانگ دُہل مصر ہیں اور فنڈرؔ اور سیلؔ اور ہنریؔ کوپی اور سمتھؔ اور ڈوزیؔ اور سپر نگرؔ کی ہمنوائی میں مُصِر ہیں اِس اعلان پر کہ:

”یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہؐ نے اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اطراف کے ممالک کو اپنے اصول اور مسلک کی طرف دعوت دی مگر اِس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے رُوم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔“ (حقیقتِ جہاد صفحہ 65)

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(قسط نمبر 3: روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 8 / مارچ 2023ء)

اگر یہ تحریر کسی اشتراکی تاریخ نویس کی ہوتی اور یہ پالیسی مارکس یا لینن یا سٹالن کی طرف منسوب کی جاتی اور ”مسلم پارٹی“ کی جگہ ”کمیونسٹ پارٹی“ کے الفاظ ہوتے تو مجھے کچھ تعجب نہ ہوتا اور مَیں بغیر کسی قلبی ہیجان کے اس عبارت کو پڑھ کر آگے گزر جاتا اور خیال بھی نہ کرتا کہ یہ کسی نے کیا لکھا ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اور یہ ایک ”مسلم راہنما“ کی تحریر ہے جو واشگاف الفاظ میں اس مقدّس ذات پر اتّہام لگا رہا ہے جس کی غلامی کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ مولوی مودودی کی تحریر ہے...... الفاظ واضح اور غیر مُبہم ہیں۔ الزام سخت گھناؤنا اور بھونڈا ہے اور صرف ایک الزام نہیں بلکہ الزام پر الزام لگایا گیا ہے۔ اِس تحریر کا

پڑھنا بھی مجھ پر سخت گراں ہے اور اس کا لکھنا بھی۔ اور ناقابلِ بیان اذیّت پہنچتی ہے جب اس فقرہ پر نظر پڑتی ہے کہ دعوت اسلام تو بھیجی مگر:

"اِس کا انتظار نہ کیا کہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوّت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔"

آنحضرتؐ کی پالیسی تو ایک معصومانہ پالیسی تھی جو ایک نوزائیدہ بچہ کے دل کی طرح پاک و صاف تھی۔ آپؐ نے تلوار اُسی وقت اُٹھائی جب آپؐ پر حدّ سے بڑھ کر مظالم توڑے گئے۔ آپؐ کے ہاتھ سلامتی کے ہاتھ تھے اور جارحیت کی تلوار سے سراسر ناآشنا تھے۔ شریف النّفس غیروں نے بھی جب آپؐ کی اِس پالیسی پر نگاہ کی تو اُسے کلیۃً سلامتی اور امن اور دفاع کی پالیسی قرار دیا۔ چنانچہ مودودی صاحب کے مندرجہ بالا الفاظ پڑھنے کے بعد اب ایک سکھ معاصر کے الفاظ بھی مُلاحظہ فرمایئے:

"اِبتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے جب آپؐ کا جینا اجیرن بنا دیا تو آپؐ نے اپنے پیرو کاروں سے کہا کہ اپنا وطن چھوڑ کر مدینے چلے جاؤ۔ یعنی اپنے کسی ہم وطن بھائی پر ہاتھ اُٹھانے کی بجائے صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پیارا وطن چھوڑنا منظور کر لیا۔ لیکن آخر کار جب اُن پر ظلم اور جبر کی حد کر دی گئی تو مجبوراً آپؐ نے اپنی اور اسلام کی حفاظت میں تلوار اُٹھائی.... یہ پرچار کہ دین کی اشاعت کے لئے جبر کرنا جائز ہے اُن احمق لوگوں کا عقیدہ ہے جنہیں نہ دین کی سمجھ ہے نہ دنیا کی۔ وہ حقیقی سچائیوں سے دُور ہونے کی وجہ سے اس غلط عقیدہ پر فخر کرتے ہیں۔"

("نواں ہندوستان" دہلی اشاعت 17-11-1949)

اس پر مَیں مزید تبصرہ نہیں کرتا قارئین کا دل خود گواہی دے گا کہ دونوں میں سے کون سچّا ہے، ایک سِکھ جریدہ نگار یا "مزاج شناس نبوت"؟

(مذہب کے نام پر خون۔ باب اشاعتِ اسلام کے بارہ میں مولانا مودودی اور بعض غیروں کے نظریات صفحہ 41-27)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ہدایت کی ضرورت، اسلام کی حقانیت، رسول اللہؐ کے ناموس اور امّت میں مسیح موعود کی آمد کے نظریات کے خلاف کھڑے ہونے والے نام نہاد

مفکر و مدبّر کے غیر اسلامی اور بودے نظریات کے جس طرح آپؒ بخئیے ادھیڑتے تھے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن قبل اس کے کہ آپ اس تحریر میں کھو جائیں، یہ مدّ نظر رہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی تحریر ایک گہرے مطالعہ، وسیع تحقیق اور دقیق پہلوؤں سے کبھی بھی تشنہ نہیں ہوئی۔ چنانچہ آپؒ کی جملہ تحریروں کا مطالعہ کریں تو وہ بتاتی ہیں کہ آپؒ جس مسئلہ کے اثبات پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے مخالف نظریات، فلسفہ، منطق اور دلائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہوئے اور ان کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اپنی دلیل اور اپنے مؤقف کو ثابت فرماتے ہیں۔ آپؒ کی تصنیف ہر سطح اور ہر طبقہ کے قاری کی نہ صرف تشنگی کی تشفّی کرنے والی ہوتی ہے بلکہ اسے لبالب سیراب کرنے والی ہے۔ آپؒ کے بیان میں تشکیک کی کوئی دھند نہیں تھی۔ آپؒ کا کلام حتمیّت سے معمور اور قطعی ہے جو اپنی صداقت کو خود ثابت کرتا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں۔ آپؒ امّت میں غیر تشریعی نبوّت کے اثبات کے نظریۂ حقّہ پر بحث کرتے ہوئے "کیا غیر تشریعی نبی آسکتا ہے؟" کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

"مسلم علماء اور مفکّرین کے طرف سے غیر تشریعی نبوت کے بند ہو جانے کے عقیدہ کو عقلاً ثابت کرنے کی دو بڑی کوششیں کی گئی ہیں۔ پہلی کوشش کا تعلق کسی بھی نئے معلّم کی ضرورت سے ہے۔ اس کی دلیل ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہادیٔ کامل کتاب کے بعد کسی اور مصلح کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر اس بات کو ثابت کیا جاسکے کہ ایک مکمل کتاب اور ہادیٔ کامل کے بعد کبھی بھی اخلاقی اور روحانی انحطاط نہیں ہوگا تو لازماً کسی اور نبی کے آنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ لیکن افسوس کہ اس نظریہ کو نہ تو دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے نہ ہی تاریخی شواہد سے۔

یہ نظریہ اس لئے بھی ناقابل تسلیم ہے کہ انبیاء صرف شریعت ہی نہیں لاتے بلکہ نبوّت تو بہت سے فضائل کا مجموعہ ہوا کرتی ہے۔ کسی تشریعی نبی کے وصال کے بعد اس کی کتاب یا سنت نبوّت کی قائم مقام نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں

کی حالت سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور مسلسل انحطاط پذیر مسلم معاشرہ اس امر کا کافی ثبوت ہے۔ آنحضرتؐ کے صحابہؓ کی بلند اور ارفع اخلاقی حالت سے عصر حاضر کے مسلمانوں کی اخلاقی حالت کو کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ حالانکہ ان کے پاس اب بھی وہی کامل اور ہر قسم کی تبدیلی اور تحریف سے پاک کتاب موجود ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے تھی۔

ہر قسم کی نبوّت کے کلّیۃً بند ہو جانے کے عقیدہ کے حق میں دی جانے والی دوسری دلیل کا تعلق انسان کی ذہنی بلوغت سے ہے۔ اس نظریہ کے سب سے بڑے علمبردار علّامہ اقبالؔ ہیں جو بعض کے نزدیک دور حاضر کے سب سے بڑے مسلم مفکّر ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی ہے کہ قرآن کریم کا نزول اس وقت ہوا جب انسان ذہنی اور عقلی بلوغت کے معراج کو پہنچ چکا تھا۔ لہٰذا اب اسے مرسلین کی وساطت سے ہر وقت راہنمائی کی ضرورت نہیں جیسی اس کے آباء واجداد کو تھی۔ کیا خوب فلسفہ ہے! لیکن باریک بینی سے جائزہ لینے پر کتنا بودا اور حقیقت سے عاری دکھائی دیتا ہے۔ یہ مفروضہ کہ انسان اتنی ذہنی بلوغت حاصل کر چکا ہے کہ وہ کسی کامل مذہب کے چیدہ چیدہ احکام کی روشنی میں اپنے فیصلے خود کر سکے اور اپنے لئے آپ کوئی ضابطۂ اخلاق مرتّب کر سکے، کئی اعتبار سے قابل تنقید ٹھہرتا ہے۔

اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ ترقی کے ہر زینہ پر انسان نے اپنی دانست میں ہمیشہ یہی سمجھا ہے کہ وہ ذہنی بالیدگی کی آخری حدود کو چھو رہا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ہر عہد کے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ انہوں نے انسانی ترقی کی معراج کو پالیا ہے۔ اپنے نسبتاً بلند مقام سے نیچے دیکھتے ہوئے انہیں گزشتہ نسلیں مقابلۃً یقیناً ناپختہ اور کم ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہوں گی۔ لیکن اس کے باوجود ماضی میں کسی بھی مرحلہ پر انسان نے اتنی عقل و دانش کا مظاہرہ نہیں کیا جس سے وہ اپنے لئے ہدایت کا راستہ خود متعین کر سکتا۔ فرعون جیسے خود سر لوگ ہمیشہ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے نبرد آزما رہے ہیں۔ اس قسم کے سرکش لوگوں نے ہمیشہ اپنی اَنا کے ہاتھوں وقت کے نبی کو ماننے سے انکار کیا۔ ان سب کا ہمیشہ سے یہی دعویٰ رہا ہے کہ وہ اپنے معاملات کو سلجھانے کے لئے

ایک پختہ شعور کے مالک ہیں۔ لیکن تاریخ نے ان سب کی خوش فہمی کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ لہٰذا اس سے زیادہ بچگانہ سوچ اور کیا ہو گی کہ انسان کسی بھی مرحلہ پر یہ خیال کرے کہ اب وہ اپنی اخلاقی اور روحانی ضروریات سے عہدہ برا ہونے کے لئے خود کفیل ہو گیا ہے۔

جہاں تک ذہنی بالیدگی کا تعلق ہے تو تاریخی حقائق نے اسے بھی غلط ثابت کر دیا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد فقہی اختلافات اور تفسیر میں باہمی فرق کی بنیاد پر ملت کا کئی فرقوں میں تقسیم ہو جانا ایک ایسا عالمگیر رجحان ہے جس سے اسلام سمیت کوئی مذہب محفوظ نہیں رہا۔ لہٰذا محض ذہنی پختگی ہی انسان کے لئے شریعت سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے خود خدا تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی بھی ضروری ہے۔ اگر انسان کی ذہنی پختگی سے یہ مراد لی جائے کہ وہ خود ہی آسمانی صحیفوں سے صحیح نتائج اخذ کرنے کے اہلیت رکھتا ہے تو پھر لازماً مذہبی تعلیمات کے تمام بنیادی مسائل پر کامل اتفاق ہونا چاہئے۔ لیکن افسوس کہ عملی زندگی میں ہمیں یہ بات نظر نہیں آتی۔ اگر مسلمان بھی جنہیں آخری کامل کتاب کے پیروکار ہونے پر فخر ہے اس کی تفسیر کے بارہ میں باہمی اختلافات میں کسی سے پیچھے نہیں رہے تو پھر یہ نام نہاد ذہنی پختگی کس کام کی؟ تاریخ مذاہب اس امر پر شاہد ہے کہ جب کسی مذہب کے پیروکار ایک دفعہ مختلف فرقوں میں بٹ جائیں تو محض انسانی کوشش سے کبھی دوبارہ متحد نہیں ہوا کرتے۔ اور یہی بات آج کے مسلمانوں پر بھی پورے طور پر صادق آتی ہے۔ کسی آسمانی مصلح کے بغیر یہ لوگ بھی واحدانیت کے ایک جھنڈے تلے دوبارہ جمع نہیں کئے جاسکتے۔ افسوس کہ انہوں نے تو اس آسمانی ذریعہ کو جو اُن کیلئے امید کی واحد کرن تھی، سرے سے ہی ردّ کر دیا۔

ہر اعتبار سے محفوظ کتاب اور نہایت حزم و احتیاط سے ترتیب دی گئی احادیث کے ذخیرہ کے باوجود جس پر مسلمانوں کا فخر بجا ہے امت مسلمہ کہ بہتّر (72) فرقوں میں تقسیم اقبال کے انسانی ذہن کی پختگی پر مبنی فلسفہ کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیتی ہے۔ مسلمانوں کے باہمی اختلافات محض فروعی نہیں بلکہ بنیادی اور گہرے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں اگر

اسلامی دنیا کی اخلاقی زبوں حالی کو بھی شامل کر لیا جائے تو ان کی یہ حالت اور بھی زیادہ قابلِ رحم اور افسوس ناک ہو جاتی ہے۔ اور اگر ان کی بقا کو ان کی ذہنی پختگی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے تو پھر تو ان کا اللہ ہی حافظ ہے۔

کتنے دکھ کی بات ہے! آج کے دانشور کیوں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کسی مذہبی معاشرہ کی پاکیزگی کے لئے محض کامل کتاب کی موجودگی کافی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام کے پیروکاروں کے عقائد میں مثالی وحدت نظر آنی چاہئے تھی۔ لیکن بد قسمتی سے حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ڈاکٹر علّامہ سر محمد اقبال کے دفاع میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی روشنی کو لفظوں کے ہیر پھیر سے روکنے کا تصوّر دراصل ان کا اپنا نہیں تھا۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے عظیم جرمن فلسفی نیٹشے (Nietzsche) کی اندھا دھند تقلید کی۔ یہ نیٹشے ہی تھا جس نے عہد حاضر میں سب سے پہلے الٰہی ہدایت کی ضرورت کے بالمقابل انسانی ذہن کی پختگی کا تصوّر پیش کیا۔ درحقیقت نیٹشے نے انسان کو ترغیب دلائی کہ وہ بالغ نظری سے اپنے حواسِ خمسہ کا استعمال کرے۔ اس نے ایسے آدمی کے لئے جو ذہنی بلوغت کو پہنچ چکا ہو اور اس کے حواس خمسہ مکمل طور پر نشو و نما پا چکے ہوں superman, overman یا فوق البشر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ایسے شخص کو رہنمائی کے لئے کسی ایسے خدا کی ضرورت نہیں ہے جو اس کے نزدیک محض ایک تصوّر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کے نزدیک اس قسم کے مفروضے اس وقت قائم کئے گئے تھے جب انسان ابھی ذہنی طور پر اتنا بالغ نہیں ہوا تھا کہ اپنی تقدیر کا خود مالک بن سکے۔ نیٹشے نے اپنی کتاب "Thus spoke Zarathustra" میں جو اس کے دانشکدہ کا علامتی ترجمان ہے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ چونکہ اب انسان ذہنی پختگی کی معراج کو پہنچ چکا ہے اس لئے اسے مفروضوں کے ساتھ چمٹے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نٹیشے لکھتا ہے:

"جب انسان دور تک پھیلے ہوئے سمندروں کو دیکھتا تھا تو خدا کو پکارا کرتا تھا لیکن اب میں نے تمہیں òverman یعنی superman کہنا سکھا دیا ہے۔"

"خدا محض ایک تصوّر ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے تصوّرات تمہارے تخلیقی ارادہ کی قوّت سے آگے نہ بڑھنے پائیں۔"

"تمہارے نزدیک خدا کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن اگر تم حقیقت تک پہنچنے کی خواہش رکھتے ہو تو اس کا مطلب ہونا چاہئے کہ ہر چیز ایسی صورت میں ہو جسے انسان سوچ سکے، دیکھ سکے اور محسوس کر سکے۔ تمہیں اپنے حواس کو بروئے کار لاتے ہوئے سوچنا چاہئے کہ ان سے کیا نتائج نکل سکتے ہیں۔"

"خدا تو ایک تصوّر ہے لیکن کون ہے جو موت کا مزہ چکھے بغیر اس تصوّر کی اذیت سے نجات پا سکے؟ Thus spoke Zarathustra کا لب لباب نیٹشے کی ایک خیالی خدا کے خلاف بغاوت ہے جو دراصل عیسائیوں کا تصوّر ہے اور Zarathustra کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے کہ اس نے کیوں خدا کی خلاف بغاوت کی، اس کتاب کے باب ریٹائرڈ (Retired) کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن ہمارے موقف کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا کافی ہے کہ نیٹشے کے دانشکدہ کے مطابق انسان آسمانی ہدایت سے مستثنیٰ ہو چکا ہے کیونکہ اب اس کی ذہنی بلوغت راہنمائی کے لئے کافی ہے۔

اقبال کا فلسفہ بھی بعینہٖ یہی ہے کہ چونکہ انسان کی ذہنی صلاحیت پختہ ہو چکی ہے اس لئے اب اسے کسی نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مستعار فلسفہ کو خدا تعالیٰ کی ضرورت سے قطعی انکار کی صورت میں استعمال کرنے کے بجائے اقبال نے ذہنی پختگی کے تصوّر کو اسلام کے تناظر میں ڈھال کر اور اس کی نوک پلک درست کر کے اسے اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ انہیں یہ تو مسلّم تھا کہ انسان کو ایک کامل مصلح اور کامل کتاب کی ضرورت ہے لیکن ایک دفعہ اس مقصد کے حاصل ہو جانے کے بعد ان کے خیال میں اسے آسمان سے مزید کسی دخل اندازی کے حاجت نہیں رہتی۔ لیکن صرف اسی پر بس نہیں۔ ذہنی پختگی کا یہ نظریہ جس میں اقبال نے کسی قدر ترمیم کی ہے نہ صرف ضرورتِ نبوّت کی نفی کرتا ہے بلکہ غیر انبیاء کے ساتھ بھی خدا کے مکالمہ مخاطبہ کا سرے سے انکار کر تا دیتا ہے۔ ان کے اس نظریہ سے صرف یہی ایک منطقی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ یہ نظریہ

انسان کو خدا تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی قسم کی مزید راہنمائی سے کلّیۃً آزاد کر دیتا ہے کیونکہ پہلے سے موجود رہنمائی کی روشنی میں اب وہ اپنے ہر قسم کے اہم فیصلے خود کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اقبال کی دلیل یہ ہے کہ انسان کوئی چھوٹا سا بچہ نہیں جس کی انگلی کسی نبی کے ہاتھ میں دے کر اسے چلنا سکھایا جائے۔ کیا وہ اتنی بلوغت حاصل نہیں کر چکا کہ از خود چل سکے؟ بظاہر یہ منطق بڑی ٹھوس ہے مگر آج کے انسان کی روحانی زبوں حالی اور اخلاقی اقدار کی مکمل تباہی پر ایک نظر ہی اس دلیل کو کلّیۃً بودا اور خیالی ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اقبال اور اس کے مفروضوں کے بارہ میں اتنا ہی کافی ہے۔ اب ذرا مودودیؔ صاحب کے نظریہ کا جائزہ لیں جو سنّی مسلمانوں کے ایک مشہور عالم ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کلّیۃً بند ہو جانا بنی نوع انسان کے لئے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں کے لئے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ کیونکہ اس طرح انہیں اب ہمیشہ کے لئے خدا تعالیٰ کے کسی سچے پیغمبر کو جھٹلانے کا خطرہ مول لینے کی حاجت نہیں رہی۔ یوں وہ امتوں کے برعکس اپنے زمانہ کے نبی کو جھٹلانے کے جرم سے بال بال بچ گئے ہیں اور خدا تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظریہ کو ایک مذاق تو کہہ سکتے ہیں، اسے ایک سنجیدہ دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگر مودودی صاحب کا فلسفہ درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نعمت کی بجائے نبوّت معاذ اللہ ایک لعنت ہے ورنہ اس کے بند ہو جانے کو نعمت اور انقطاع کو رحمت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ سوچ پولوسؔ کی سوچ کے قریب تر معلوم ہوتی ہے جس نے تورات کی شریعت کو لعنت قرار دیا تھا اور وہ حضرت مسیحؑ کو اس لئے نجات دہندہ مانتا تھا کیونکہ بقول اس کے مسیحؑ نے تورات کی شریعت کو منسوخ کر دیا تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ جب کوئی قانون موجود ہی نہیں ہو گا جسے توڑا جائے تو گناہ بھی سرزد نہ ہو گا۔ تاہم مودودی صاحب کے اس پورے فلسفہ کا ماخذ صرف پولوس ہی معلوم نہیں ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے جیسے بہاء اللہؔ کے تصوّر کے گڑے مردے

اکھاڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ پولوس کے نزدیک جس طرح حضرت مسیحؑ نے تورات کی شریعت منسوخ کر دیا تھا اسی طرح بہاء اللہ کی بھی قرآنی شریعت کے بارہ میں یہی دعویٰ ہے۔ اس نے بزعم خود بنی نوع انسان کو قرآن کریم کی غلامی سے آزاد کر دیا ہے البتہ اس نے کلّیۃً پولوس کی پیروی نہیں کی۔ کیونکہ پولوس نے کبھی مجسّم خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خدائی کو کلّیۃً حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کیا۔ اس کے نزدیک مسیح ایک ایسا نجات دہندہ تھا جس نے خدا باپ کی طرف سے بنی نوع انسان کے خلاف کی جانے والی غلطی کا ازالہ کر دیا۔ اس کے نزدیک شریعت کا نفاذ بذاتِ خود گناہ کو پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا شریعت کو منسوخ کر کے مسیحؑ نے گناہ کے بیج کو ہی ختم کر دیا۔ بنی نوع انسان کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ گویا اس نے خدا باپ کو بھی گناہ پیدا کرنے کی غلطی سے نجات دلا دی۔

بہاء اللہ اس فلسفہ کا جزوی طور پر اطلاق کرتے ہوئے یہ دلیل دیتا ہے کہ قرآنی شریعت چونکہ بہت سخت اور مشقت میں ڈالنے والی ہے لہٰذا دور حاضر کے انسان کے لئے قابل عمل نہیں رہی۔ یوں بزعم خود اس نے بنی نوع انسان کو اس تکلیف دہ بوجھ سے اگرچہ نجات تو دلا دی مگر مکمل نجات نہیں۔ اس نے پہلی شریعت منسوخ کر کے ایک نئی شریعت گھڑ لی لیکن آخرکار وہ خدا تعالیٰ کا اور خود اپنا تمسخر اڑانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اس نے قرآنی شریعت کو منسوخ کر کے جو شریعت پیش کی وہ عقل سلیم، تفکر اور معقولیت کے کھلی توہین کے سوا کچھ نہیں۔

یوں لگتا ہے کہ پولوس کے ان دونوں جدید شاگردوں یعنی بہاء اللہ اور مودودی صاحب نے مل کر اسلام کے خاتمہ کی پوری کوشش کی ہے۔ جہاں تک قرآنی شریعت کا تعلق ہے تو جس طرح بہاء اللہ نے اسے آزادی کے نام پر قربان کر دیا اسی طرح نبوّت کو مودودی صاحب نے پولوسی فلسفہ کی بھینٹ چڑھانے کی جسارت کی۔ دونوں ہی خدا کی نظر میں اپنے اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے۔ دونوں ہی ان لوگوں کی نظر میں ہیرو قرار پائے جو خود روحانی امراض کا شکار تھے۔ لیکن مودودی صاحب نے پورے طور پر پولوس کی پیروی نہیں کی۔ انہوں نے یہ تجویز کرنے کی جرأت

تو نہیں کی کہ خدا تعالیٰ کو چاہئے کہ قرآنی شریعت ہی کو منسوخ کر دے تا کہ لوگ اس کی نافرمانی کر کے مغضوب نہ بنیں۔ مودودی صاحب نے پولوس کے اصول کے اطلاق کو صرف نبوّت کے منصب تک محدود رکھا۔ چنانچہ ان کے نزدیک اگر اسلام کے مقدّس بانیؐ کے بعد خدا تعالیٰ کی طرف سے امّتی نبی بھی بھیجے گئے تو غالب امکان ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کا انکار کر دے جیسے ان سے پہلے نبیوں کا انکار ہوتا چلا آیا ہے۔ اس طرح مودودی صاحب کی منطق کے مطابق خدا تعالیٰ کی لعنت کا خطرہ دو دھاری تلوار کی طرح ان کے سروں پر لٹکتا رہے گا۔ مودودی صاحب کی نظر میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کا سلسلہ کلّیۃً بند کر کے بنی نوع انسان پر بے انتہا رحمتیں نازل کی ہیں خصوصاً مسلمانوں پر۔

لوگوں کو لعنت سے بچانے کے لئے نبوّت کے سلسلہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ تو خود نبوّت کو لعنت قرار دینے کے مترادف ہے۔ اس طرح مودودی صاحب کا یہ جدید پولوسی فلسفہ خدا تعالیٰ سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ نبوّت کی لعنت کو سرے سے ہی ختم کر دے۔ کیسی نجات اور گناہوں سے کیسی آزادی۔ خس کم جہاں پاک!

لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ فلسفہ ماضی اور مستقبل دونوں پر یکساں اطلاق پاتا ہے۔ آنحضرتؐ سے پہلے حضرت مسیحؑ کو کیوں مبعوث کیا گیا؟ کیا قرآن کریم حضرت مسیحؑ کے انکار کی وجہ سے یہودیوں کا کلّیۃً ملعون قرار نہیں دیتا؟ اور پہلی قوموں کا کیا حشر ہوا؟ کیا انہوں نے خدا تعالیٰ کے فرستادوں کا انکار نہیں کیا اور ان کے ساتھ ہنسی ٹھٹھا کا سلوک نہیں کیا گیا؟

بنی نوع انسان کے کبر اور نخوت کا یہ کیسا افسوس ناک منظر ہے! چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (یٰسٓ:31) ترجمہ: وائے حسرت بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے ٹھٹھا کرنے لگتے ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کو اس لعنت کو ختم کر دینے کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔ انبیاءؑ کے ساتھ واسطہ پڑنے کے لمبے تاریخی سفر کے دوران یہودیوں کا کیا حشر ہوا؟ کیا ان پر حضرت داؤدؑ

کی زبان سے لعنت نہیں ڈالی گئی؟ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیانی عرصہ میں اہلِ کتاب کا کیا حال ہوا؟

کیا ہر زمانہ کے لوگوں کا خدا تعالیٰ کے تمام انبیاءؑ کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک خدا تعالیٰ کو یہ باور کرانے کے لئے کافی نہیں تھا کہ نبوت رحمت نہیں بلکہ لعنت ہے؟ پھر حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، اور حضرت لوطؑ کی بعثت کا کیا مقصد تھا؟ کیا ان کی تکذیب کی وجہ سے ان کی اقوام پر خدا تعالیٰ کا غضب نازل نہیں ہوا؟ سوائے چند بظاہر بے حیثیت لوگوں کے کیا انہیں صفحہء ہستی سے مٹا نہیں دیا گیا؟ تاہم جو خیال مودودی صاحب کو سوجھا وہ خدا کو کیوں نہ سوجھ سکا۔ خدا تعالیٰ کے بارہ میں یہ دیو مالائی تصوّر کہیں مودودی صاحب کے دماغ نے خود ہی تو نہیں گھڑ لیا؟ ایسی ناقص رائے انہیں کے دماغ کا شاخسانہ ہو سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ پیغمبر پر پیغمبر بھیجتا رہا لیکن متکبر لوگ ایک کے بعد دوسرے فرستادہ کا انکار کرتے رہے۔ اس طرح وہ لوگ جس لعنت کے مورد ہوئے اس کی ذمہ داری نبوّت پر عائد نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ لوگ خود ہی اس کے ذمہ دار تھے۔

اگر یہ دلیل ایک زمانہ کے لئے قبول کر لی جائے تو پھر اسے حضرت آدمؑ کے وقت سے لے کر ہر زمانہ کے لئے قبول کرنا پڑے گا۔ اس امر کا احتمال کہ آدمؑ کی قوم انبیاءؑ کو جھٹلا کر مغضوب ہو جائے گی کیا خدا تعالیٰ کے لئے کافی جواز تھا کہ وہ حضرت آدمؑ کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔ اگر یہ خوف کہ لوگ امّتِ محمدیہ میں سے مبعوث کئے گئے نبی کا انکار کر دیں گے، نبوّت ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کا مناسب جواز ہے تو اس کو اور بھی زیادہ شدّت کے ساتھ خود اسلام کے مقدّس بانیؐ کی بعثت کی راہ میں روک بن جانا چاہیئے تھا۔ کیا آپؐ سب نبیوں سے افضل نہیں؟ یقیناً ہیں۔ اور سارا عالم اسلام اس پر گواہ ہے، تو سب انبیاء سے افضل ہونے کے باعث آپ کا انکار خدا تعالیٰ کے سب سے زیادہ قہر کا موجب ہونا چاہیئے۔ افسوس! مودودی صاحب نے اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں دنیا بھر کی بیشتر آبادی نے آپؐ انکار کر دیا تھا بلکہ آج بھی بنی نوع انسان کی تین چوتھائی آبادی آپؐ کی سچائی کی منکر ہے۔ زیادہ سے زیادہ انسانی آبادی کے

ایک چوتھائی حصہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار کہا جاسکتا ہے لیکن کیا وہ بھی صحیح معنوں میں مسلمان کہلا سکتے ہیں؟ کیا ان کا آپؐ اپر ایسا سچا ایمان ہے کہ وہ حقیقی مومن شمار ہوں۔ مودودی صاحب کا خیال اس کے برعکس ہے۔ مسلمانوں کی ایک ارب کی آبادی میں سے 999 فی ہزار پر انہوں نے عملاً مسلمان نہ ہونے کا فتویٰ لگا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان کہا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لئے یہ مسلمان ہیں۔“

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش صفحہ 130 جلد 3 پہلا ایڈیشن ناشر مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام پٹھانکوٹ)

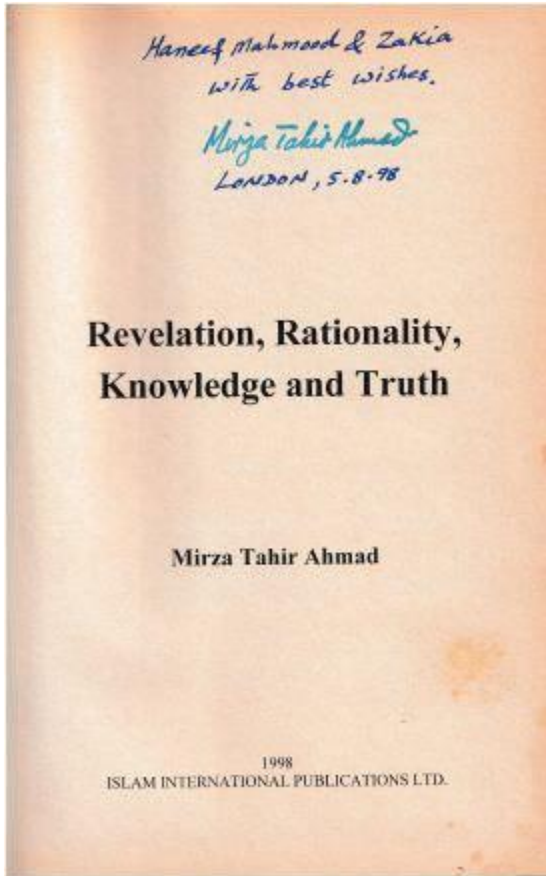
مودودی صاحب کے اس فلسفہ کے مطابق تو بہتر تھا کہ خدا تعالیٰ نہ تو کوئی کتاب بھیجتا اور نہ کوئی پیغمبر تا کہ بیچاری مخلوق کو ہمیشہ لعنت سے چھٹکارا مل جاتا۔

بایں ہمہ مودودی صاحب حضرت آدمؑ سے لے کر خیر الانبیا تک خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے پیغمبروں کے سلسلہ کو جائز ٹھہراتے ہیں۔ اگر فرستادوں کی تکذیب کی وجہ سے منکرین پر خدا کی لعنت پڑتی ہے تو ایک اور نبی کے اضافہ سے کونسی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ مودودی صاحب کا تضاد اس وقت اور بھی کھل کے سامنے آجاتا ہے جب ان کے اس عقیدہ کا علم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی بطور نبی اللہ آمد ثانی کے بھی قائل ہیں۔

اگر پہلے مسیح کی بجائے امتِ مسلمہ میں سے ہی ایک غیر تشریعی نبی مبعوث ہو تو اس کے آنے سے لعنت کے اس دائمی فلسفہ پر کیا فرق پڑے گا؟ صرف امتی نبی کے آنے پر اعتراض کیوں جبکہ بقول مودودی صاحب حضرت آدمؑ سے لے کر اب تک تمام انبیاءؑ دائمی لعنت کے اس قانون کے اطلاق کا باعث بنتے چلے آئے ہیں!

(الہام، عقل، علم اور سچائی صفحہ 589 تا 598 اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز مطبوعہ 2007ء)

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی پیش کردہ اس ناقابل تردید اور اللہ تعالیٰ کی تقدیروں میں پیوستہ بحث سے یہ واضح ہے کہ آپؒ کی تحریر کی یہ بھی ایک نمایاں خوبی ہے کہ جہاں آپؒ کی دلیل اور منطق شستہ و ملائم ہے اور طبیعت پر نہایت گداز اثر چھوڑتی ہے، وہاں وہ مکذّب و مفتری کو بھگانے کے لئے شہاب ثاقب بھی ہے۔ آپؒ مدّ مقابل کی دلیل کی نہ صرف خاک اڑا دیتے ہیں بلکہ وہ خاک اس کے سر پر بھی ڈالتے چلے جاتے ہیں۔



چنانچہ یہ منظر بھی ملاحظہ فرمائیں کہ دیوبندی ٹولے کے ایک سرخیل مولوی محمد یوسف بنوری صاحب اصدق الصادقین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوّت کی علمبرداری

کے پرلے درجہ کے جھوٹے دعویدار تھے۔ باوجود دینی مدرسوں سے تحصیلِ علوم کے، صفات بوجہلی کے اکمل واتمّ شاہکار تھے۔ انہوں نے غالباً 1975ء میں کذب وافتراء سے لبریز ایک کتابچہ لکھا جس کا نام تھا ''ربوہ سے تل ابیب تک''۔ اس میں انہوں نے جس حد تک ممکن تھا یا جس انتہا تک ان کی پہنچ تھی، یہودیت اور احمدیت کی مماثلت ثابت کرنے کے لئے جھوٹ کے پُل پر پُل باندھ دیئے۔ وہ یہ چھل کتابچہ لکھ تو بیٹھے مگر حضرت صاحبزادہ صاحبؒ کے ہتھے چڑھ گئے۔ آپؒ نے کس طرح ان سے معاملہ کیا، اس کے ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں۔ مولوی بنوری صاحب نے لکھا تھا کہ:

''اسرائیلی سٹیٹ یہود، برطانیہ اور امریکہ کی سازش سے قائم ہوئی اور ربوہ سٹیٹ انگریز گورنر کی سازش سے۔''

اس کے جواب میں حضرت صاحبزادہ صاحب نے ''ربوہ سے تل ابیب تک پر مختصر تبصرہ'' کے نام سے چھوٹی سی کتاب مرتّب فرمائی۔ آپؒ کی تحریر ملاحظہ فرمائیں کہ آپؒ کس طرح عقلی دلیل دیتے ہوئے معترض کے گِرداگِرد منطقی منظر کشی کی ایسی باڑ باندھ دیتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی جائے فرار نہیں چھوڑتے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

''افسوس کہ مولانا صاحب کو سٹیٹ یعنی ریاست اور ٹاؤن یعنی قصبہ کے درمیان بھی فرق معلوم نہیں۔ اسرائیل ایک باقاعدہ خود مختار ریاست اور حکومت ہے جسے سامراجی طاقتوں نے بزورِ شمشیر نہایت ظالمانہ اور غاصبانہ طور پر سرزمینِ فلسطین میں قائم کیا اور ربوہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو شہر چنیوٹ سے چھ میل مغرب کی طرف دریائے چناب کے کنارے آباد ہے۔ اس کا کل رقبہ /1034 ایکڑ ہے۔ یہ رقبہ اتنا چھوٹا ہے کہ گزشتہ زرعی اصطلاحات سے قبل کثیر تعداد میں درمیانی درجہ کے زمینداروں کے پاس اس سے بڑھ کر رقبہ موجود تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ سب تحصیل لالیاں، تحصیل چنیوٹ، ضلع جھنگ، صوبہ پنجاب میں حکومت پاکستان اور پنجاب کی عملداری میں اسی طرح شامل ہے جس طرح پاکستان کی ایک ایک

انچ دوسری زمین۔ حکومت پاکستان کے کل پُرزے یہاں اسی طرح کام کرتے ہیں جس طرح پاکستان کے دیگر دیہات قصبات اور شہروں میں۔اس قصبہ کو ایک آزاد مملکت کا نام دے کر اسرائیل کی ریاست سے تشبیہہ دینا سادگی یا مکاری کی انتہاء ہے۔ اگر ایک ہزار ایکڑ پر پھیلے ہوئے اس چھوٹے سے قصبے کو اسرائیل کی طرح آزاد ریاست کہنا جائز ہے تو لاہور شہر کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ یا روس کی سوویٹ سوشلسٹ ریپبلک سے تشبیہہ دینا کسی طرح مبالغہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ باقی رہا عظیم شہر کراچی تو وہ ایک عظیم آزاد براعظم سے کم نہیں۔ پس پاکستان میں اگر لاہور جیسی عظیم آزاد ریاست قائم ہو سکتی ہے جو دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت کے مشابہ ہے اور کراچی جیسا عظیم تر براعظم سما سکتا ہے تو اسرائیل کے برابر چھوٹی سی ریاست ربوہ پر کیا اعتراض ہے ؟واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں ربوہ سے بہت بڑی اور طاقتور اتنی عظیم مملکتیں موجود ہیں کہ اگر دنیا میں ان کی نظیر ڈھونڈی جائے تو سب دنیا ختم ہو جائے گی لیکن پاکستان کی آزاد ریاستیں باقی رہیں گی۔ ربوہ کے مغرب میں ایک عظیم ریاست لالیاں ہے۔ مشرق میں کئی گنا بڑی مملکت چنیوٹ ہے۔28 میل مغرب میں ریاست ہائے متحدہ سرگودہا واقع ہے اور 28 میل مشرق میں ریاست ہائے متحدہ لائلپور (فیصل آباد) رونق افروز ہے۔ معلوم نہیں کیوں مولانا کو ربوہ کا تنکا تو نظر آ گیا۔ یہ بڑے بڑے شہتیر نظر نہیں آئے۔ جناب مولانا صاحب شاید یہ پڑھ کر ہم پر الزام لگائیں کہ تم اس بات کو مذاق میں ٹال گئے ہو۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ اگر یہ مذاق ہے تو اس مذاق کی ابتداء آپ نے فرمائی ہے اور آپ ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ اگر آپ ربوہ کو ''اسٹیٹ'' قرار دینے میں سنجیدہ تھے تو پھر سمجھ لیجئے کہ ہم بھی سنجیدہ ہیں۔اب یہ ذمہ داری آپ کی ہے کہ ثابت فرمایئے کہ حکومتِ پاکستان کو لالیاں، چنیوٹ، سرگودہا، لائلپور، لاہور اور کراچی وغیرہ پر کونسی ایسی سیاسی طاقت حاصل ہے جو ربوہ پر نہیں ؟ کیوں ربوہ پاکستان کا حصہ نہیں؟ پاکستان کے وہ کونسے قوانین ہیں جو اس ہزار ایکڑ رقبہ پر اطلاق نہیں پاتے ؟ دنیا میں کون کون سے ممالک ہیں جو ''ربوہ سٹیٹ'' کو ایک خود مختار ریاست کے طور پر تسلیم کر چکے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات

پیدا ہوتے ہیں۔ آپ اگر ان کا تسلی بخش جواب دے دیں تو پھر پاکستان کے ہر شہری کا حق ہے کہ حکومت پاکستان سے پوچھے کہ ”ریاستِ ربوہ“ کو کیوں حکومت پاکستان نے تسلیم کر رکھا ہے اور قومی اسمبلی کے کس فیصلہ کے مطابق پاکستان کا یہ ٹکڑا پاکستان کی عملداری سے نکال کر خود مختار ”ریاستِ ربوہ“ کے نام منتقل کیا گیا تھا؟

(”ربوہ سے تل ابیب تک“ پر مختصر تبصرہ۔ صفحہ 47 تا 49۔ شائع کردہ مکتبہ الفرقان ربوہ جون 1976ء)

یہ انداز تحریر بتاتا ہے کہ آپؒ جھوٹے کی دلیل کو شمشیر منطق سے ایسی ملائمت سے کاٹ دیتے ہیں کہ چند ثانیوں میں ہی وہ روئے خجلت آلودہ ہو کر بے وقعت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بنوری صاحب کی بیان کردہ ”دسویں حیرت انگیز مماثلت“ کے عنوان کو لے کر حضرت صاحبزادہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

”معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا الزام عائد کرنے کے معاً بعد جناب مولانا صاحب کو خود ہی یہ خیال آیا کہ انگریز گورنر نے سازش کر کے ربوہ سٹیٹ تو قائم کر دی لیکن بعد کے مسلمان گورنروں نے اسے آج تک قائم کیوں رہنے دیا؟ اور کیوں بعد میں قائم ہونے والی مختلف مرکزی حکومتوں نے اس بستی سے ایک خود مختار آزاد ریاست کے اختیارات چھین نہیں لئے؟ قسمت کی یاوری دیکھئے کہ اس پیچیدہ سوال کا حل تلاش کرتے ہوئے ”مولانا“ صاحب کو نہ صرف جواب مل گیا بلکہ ایک بے نظیر دسویں مماثلت بھی ہاتھ آئی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا صاحب فرماتے ہیں:

”یہودی سٹیٹ عالم اسلام کے عین قلب میں امریکی امداد کے سہارے زندہ ہے اور اگر اس کا یہ سہارا ختم ہو جائے تو وہ ایک دن بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح قادیانی سٹیٹ بھی اپنے مغربی آقاؤں کے بل بوتے پر عالم اسلام کے مایہ ناز ملک پاکستان کے عین قلب میں باقی ہے۔ اگر اس کا یہ سہارا ختم ہو جائے تو وہ ایک دن بھی باقی نہیں رہ سکتی۔“

دیکھئے! مماثلتوں کی دنیا میں کیا بات پیدا فرمائی ہے مولانا صاحب نے! بھلا ہے کوئی اس کی مثال؟ یہودی سٹیٹ نے ارد گرد کے مسلمان ممالک پر خطرناک حملے کئے یا ایسے حالات پیدا کئے

کہ وہ خود ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئے مگر تین نہایت ہولناک اور تباہ کن جنگوں کے باوجود استعماری طاقتوں کی فوجی امداد کی وجہ سے اسرائیل کو فیصلہ کن شکست نہ دی جا سکی۔ بلکہ ہر جنگ کے اختتام پر پہلے سے زیادہ مسلمان علاقوں کو اس نے غصب کر لیا۔ یہ ہے چند لفظوں میں اسرائیل کے باقی رہنے کی داستان۔

یہ داستان کہ بالکل اسی طرح ربوہ سٹیٹ نے کتنی بار پاکستان، ایران اور افغانستان کی مسلمان ریاستوں پر حملے کئے یا ایسے حالات پیدا کئے جن سے یہ عظیم مسلمان ریاستیں خود ربوہ سٹیٹ کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئیں۔ جناب مولانا صاحب ہی سنائیں کیونکہ کوئی دوسرا پاکستانی شہری خواہ احمدی ہو یا غیر احمدی، اس سنسنی خیز تاریخ کے حالات سے واقف نہیں۔

مولانا! مماثلت کو مکمل کرتے ہوئے ازراہ شفقت اعداد و شمار سے پردہ اٹھاتے ہوئے کیا یہ بھی بتائیں گے کہ ان جنگوں کے دوران ربوہ سٹیٹ کو کتنے ہوائی جہاز، کتنی دورمار توپیں، کتنے ٹینک اور کتنی میزائلیں اپنے ''مغربی آقاؤں'' سے ملیں اور ان جنگوں کے دوران برسرِپیکار ریاستوں کا کیا جانی و مالی نقصان ہوا۔ نیز ان جنگوں کے اختتام پر کتنے ایکڑ اور کتنی کنال مزید اراضی ربوہ سٹیٹ نے ان مسلمانوں سے چھین لی؟ مولانا کی یہ رپورٹ جب شائع ہو گی اس زمانے کا سب سے زیادہ حیرت انگیز انکشاف ہو گا۔ کیونکہ یہ تاریخ کے عہدِ حاضر کا ایک ایسا باب ہے جس سے روئے زمین پر تمام بنی نوع انسان میں سے مولانا کے سوا کوئی واقف نہیں۔ یہ تو تھا اس مماثلت کا حال۔ اب رہا یہ سوال کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حکومتِ پاکستان جب بھی ربوہ سٹیٹ پر فوج کشی کا ارادہ کرتی تھی، مغربی طاقتیں مثلاً انگریز وغیرہ حکومت پاکستان کو اسی قسم کی دھمکیاں دے کر اپنے ارادہ سے باز رکھتی رہیں کہ اگر تم نے ربوہ سٹیٹ پر فوج کشی کی تو ہم تم پر فوج کشی کریں گے۔

یہ معاملہ چونکہ یا تو صرف مولانا کو معلوم ہے یا پھر پاکستان کی گزشتہ اور موجودہ حکومت کے اربابِ حلّ وعقد کو معلوم ہو سکتا ہے۔ اس لئے جب تک اس منظر سے وہ پردہ نہ اٹھائیں ہم کیا عرض کر سکتے ہیں۔ مولانا ایک دینی رہنما ہیں۔ عام اخلاقی اصولوں کے مطابق پاکستان کے ہر شہری

کو ان سے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں پوری ذمہ داری سے کہتے ہیں۔ ہم پاکستان کے شہریوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر مولانا ہماری درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھیں تو پاکستان کے دوسرے شہری ان کو اس بات پر آمادہ کریں کہ تاریخ کے مذکورہ بالا دونوں ابواب سے پردہ اٹھائیں۔ ہاں ایک شرط ہے کہ اپنے بیان میں اعداد و شمار ضرور دیں اور ان دستاویزات کی تصویریں بھی شائع فرمائیں جن کی بناء پر مولانا یہ سنسنی خیز انکشافات فرمائیں گے۔"

("ربوہ سے تل ابیب تک" پر مختصر تبصرہ۔ صفحہ 53 تا 55۔ شائع کردہ مکتبہ الفرقان ربوہ جون 1976ء)

ان تحریروں کے شیشے میں ذرا مولوی بنوری صاحب کو اتار کر تو دیکھیں! انہوں نے کذب و افتراء کے اوٹنگے کو اپنی مہا مکاری کے ازار سے باندھنے کی کوشش تو کی مگر اس کی گرہ نہ باندھ سکے۔ لہٰذا چوراہے میں عریاں ہو گئے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی تحریروں میں ادب کی ایک گوناں لذّت ہے۔ چنانچہ آخر میں اس ذکر سے نکلتے ہوئے چند ادب پاروں کا مزہ لیتے چلتے ہیں۔ آپؒ صبح و مسا اور شب و روز کی گھنی مصروفیات کی تھکن کو بھی محسوس فرماتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ذمہ داریوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ماضی کی آزاد فضا کی یاد کے جھونکے یوں لگتے ہیں جیسے پسِ زنداں کسی قیدی کو روزن زنداں سے نسیم سحر کا جھونکا پہنچ جائے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ اَلدُّنْیَا سِجْنٌ لِّلْمُؤْمِنِ کی حدیث کتنی گہری اور وسیع ہے۔ ایک غیر مرئی قید خانے میں زندگی بسر کرنا جس سے باہر کی دنیا صاف دکھائی دیتی ہو اور کوئی ٹھوس دیوار راہ میں حائل نہ ہو، مومن کی ایک ایسی تعریف ہے جو خدا تعالیٰ کے خاص فضل اور احسان کے سوا کسی پر صادق نہیں آسکتی۔"

ایک مرتبہ ائیر پورٹ پر جہاز کی پرواز سے قبل اور پھر اس کی تاخیر میں انتظار کی کوفت سے بچنے کے لئے ان الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے لکھا:

”وقت بھی عجیب الٹی کھوپڑی کی چیز ہے۔ دل چاہے کہ ٹھہر جائے تو ایسا بگٹٹ دوڑنے لگتا ہے کہ قابو کا نہیں رہتا۔ جتنا روکو اتنا تیز، یہاں تک کہ آناً فاناً سارے کا سارا ہاتھ سے نکل یہ جاوہ جا، ماضی میں ڈوب جاتا ہے۔ جیسے کسی شاعر کی آس کا پنچھی افق میں ڈوبنے کا مصمم ارادہ کئے سینہ پھاڑ کر نکل بھاگا ہو۔

جب دل چاہے کہ وقت ذرا ہلے جلے، کچھ دو چار قدم چلے، کچھ ٹانگیں سیدھی کرے، کوئی گز بھر فاصلہ طے کرے تو کم بخت ایسا اٹکتا ہے جیسے خچر اڑ جاتا ہے۔ آگے کو دھکیلو تو پیچھے کو چلنے لگتا ہے۔ ایسا دھرنا مار کر بیٹھ جاتا ہے جیسے زندگی بھر وہیں بیٹھا رہے گا، وہیں مرے گا وہیں گاڑا جائے گا۔ ہاتھ پاؤں تو الگ رہے انگلی تک ہلائی نہیں جاتی۔ جیسے گنٹھیا کا پرانا مریض ہو۔ ایسے میں انسان کی کچھ پیش نہیں جاتی، وقت کا لاشہ گھسیٹ گھسیٹ کر تھوڑا سا دم لے کر پھر کچھ زور آزمائی کر کے ہانپتا کانپتا انسان بالآخر اس دلدل سے باہر آہی جاتا ہے۔

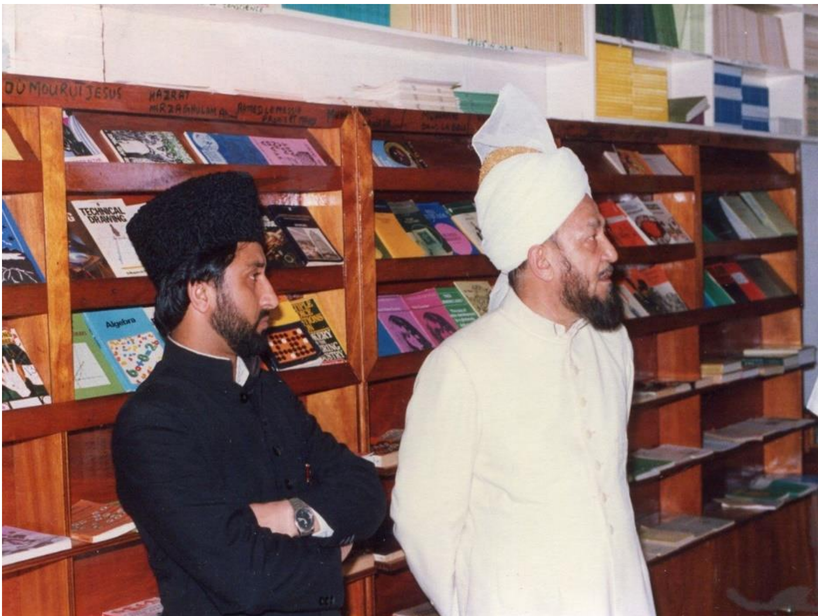
چارو ناچار میں بھی اس دلدل سے باہر آہی گیا۔ لیکن آگے دیکھا تو جہاز میاں لیٹ ہوئے ہوئے تھے۔ وقت کی دلدل کے کنارے بیٹھ گیا تو وقت نے میرا وہ منہ چڑایا کہ کیا بتاؤں، ہنستا تھا اور کہتا تھا اور گھسیٹو مجھے، اب کر لو صبر۔ ہوائی جہاز پر اچھا ساتھ مل گیا تو وقت بھی ہوا کے دوش پر سوار اڑنے لگا۔“

استاذی المکرم محترم سیّد میر محمود احمد صاحب 1982ء اور اس کے چند سال بعد تک سپین میں مبلغ انچارج کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ آپؒ نے انہیں احمدیت اسلام کی آغوش میں آنے والی روحوں کی حفاظت اور نگہداشت کے بارے میں تحریر فرمایا:

”اللہ تعالیٰ آپ کو بکثرت مسلمان بنانے کی توفیق بخشے۔ میری تاکیدی نصیحت یہ ہے کہ نو مسلموں کو کبھی سپرداری کے بغیر نہ چھوڑیں ورنہ وہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً سپین میں تبلیغ اسلام کی گزشتہ تیس چالیس سالہ جدوجہد سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔ کیسا دردناک منظر ہے کہ اندر آنے اور باہر جانے کے دونوں راستے یکساں گزرگاہ بنے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی

شکاری خوفناک درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں ہرنوں اور بھیڑیوں کو زیر دام لالا کر درختوں سے باندھتا ہوا گزرتا چلا جائے اس امید پر کہ بعد فرصت کسی دن ان کے ریوڑ بناؤں گا۔ کیا ایسے شکاری کا ماحصل حسرت کے سوا کچھ ہو سکتا ہے؟

پس اسلام میں آنے والی کسی معصوم روح کو سپرداری کے بغیر مادہ پرستی کے ہولناک جنگل میں تنہا نہ چھوڑیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے بہتر اور کس کی سپرداری ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک اُن کی تربیت کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے والے روح پرور واقعات انہیں سناتے رہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء کی سیرت کا سب سے نمایاں پہلو یعنی اپنے ربّ کی محبت اُن کے سامنے بار بار پیش کریں۔ خود اُن سے دعائیں کروائیں اور ساتھ ہی اُن کے لئے دعاؤں میں لگ جائیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں قبولیت دعا کا چسکا ڈال دے۔ وہ اللہ سے محبت اور پیار کی باتیں کئے بغیر رہ نہ سکیں۔ دعا اُن کا اوڑھنا، بچھونا، ان کی روح کی غذا، اُن کا مشرب بن جائے۔ تب آپ سمجھیں کہ سپرداری کا حق ادا ہوا۔“



زبان کی فصاحت و بلاغت اور تحریر و تقریر کی تاثیر کے اصل راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھا:

”بارہا میں نے سوچا کہ فصاحت و بلاغت کس کو کہتے ہیں اور ہر بار اس کے سوا کوئی جواب نہ پایا کہ ”سچائی“ کو۔ سچی عبارت سے بڑھ کر فصیح و بلیغ عبارت اور کوئی نہیں ہوتی۔ جو دل سے اٹھتی ہے اور سیدھا دل میں اتر جاتی ہے اور پھر بسا اوقات دعا کے بخارات بن کر اٹھتی اور آنکھوں سے برستی ہے۔“

قارئین کرام! یہ مضمون اس حقیقت کی شہادت ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایک ایسے آفاقی عالم، متکلّم اور ادیب تھے جن کا ایک ایک حرف، لفظ، فقرہ، تحریر اور کلام سچّائی پر اور اللہ تعالیٰ کی خاص عطا پر استوار تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے:

ایک ایک لفظ آپؒ کا اترا ہو عرش سے

(ہادی علی چوہدری۔ نائب امیر جماعت احمدیہ کینیڈا)

(قسط نمبر 4: روزنامہ الفضل آن لائن لندن مؤرخہ 15 / مارچ 2023ء)

مضامین کے لنکس

1. حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا وصفِ شعر و سخن (قسط اول)

https://www.alfazlonline.org/13/04/2022/58491/

2. حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ کا وصفِ شعر و سخن (قسط دوم)

https://www.alfazlonline.org/14/04/2022/58587/

3. ایک شہرہ آفاق صداقت انفاس خطیب (قسط اول)

https://www.alfazlonline.org/18/08/2022/66681/

4. ایک شہرہ آفاق صداقت انفاس خطیب (قسط دوم)

https://www.alfazlonline.org/20/08/2022/66802/

5. حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب (قسط1)

https://www.alfazlonline.org/22/02/2023/79455/

6. حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب (قسط2)

https://www.alfazlonline.org/01/03/2023/79992/

7. حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب (قسط3)

https://www.alfazlonline.org/08/03/2023/80415/

8. حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ ایک آفاقی عالم، متکلم اور ادیب (قسط4۔ آخری)

https://www.alfazlonline.org/15/03/2023/80736/



ادارہ الفضل آن لائن کی کتب

1. اسلامی اصطلاحات کا بر محل استعمال
2. ارشادات حضرت مسیح موعودؑ بابت مختلف ممالک و شہر
3. جماعت احمدیہ کے ذریعہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں خلافت خامسہ کا عظیم الشان کردار اور معیت الٰہی
4. ارشادات نور
5. کتابِ تعلیم
6. ذیلی تنظیموں کا تعارف اور اس حوالے سے مضامین
7. مجدد دین اسلام۔ تعارف و کارہائے نمایاں
8. میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا
9. جماعت احمدیہ کا نظام خلافت

10. اداریے (حنیف محمود کے قلم سے) جلد اول
11. حیات نورالدینؓ
12. دعا، ربوبیت اور عبودیت کا ایک کامل رشتہ ہے
13. قرآنی انبیاء
14. معلمین وقف جدید کے لئے مشعل راہ
15. جامع المناھج والاسالیب
16. مقام وعظمت خلافت
17. اداریے (حنیف محمود کے قلم سے) جلد دوم
18. الفضل کی اہمیت، افادیت اور قلم کے استعمال کی ترغیب
19. مسز ناصر کی کہانی، مسز ناصر کی زبانی
20. واقعہ افک
21. اداریے (حنیف محمود کے قلم سے) جلد سوم
22. قرآنی سورتوں کا تعارف
23. سیدنا حضرت امیر المؤمنین کا دورہ امریکہ 2022ء
24. ربط ہے جانِ محمد سے مری جاں کو مدام
25. سیدنا حضرت مصلح موعودؓ (روزنامہ الفضل آن لائن لندن کے اوراق سے)
26. جماعت احمدیہ کی دنیا بھر میں مساجد
27. احمدیت کے چمکتے ستارے۔ شہدائے برکینا فاسو
28. لجنہ اماء اللہ کے سو سال
29. دلچسپ و مفید واقعات و حکایات
30. اپنے جائزے لیں

31. دعاؤں کا تحفہ قرآنی دعائیں
32. اداریے بابت رمضان المبارک
33. خلافت۔ اہمیت،فضلیت و برکات
34. ممکنہ تیسری عالمی جنگ
35. سیدنا حضرت مسیح موعودؑ (روزنامہ الفضل آن لائن لندن کے اوراق سے)
36. ایک سبق آموز بات
37. حاصل مطالعہ (روزنامہ الفضل آن لائن لندن کے اوراق سے)
38. بچوں کی تقاریر از فرخ شاد (زیر تکمیل)
39. اداریے (حنیف محمود کے قلم سے) جلد چہارم (زیر تکمیل)
40. بنیادی مسائل کے جوابات (زیر تکمیل)
41. تبلیغ میں پریس اور میڈیا سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے (زیر تکمیل)
42. اداریے بلحاظ ترتیب مضامین جلد اول (زیر تکمیل)
43. ہجری شمسی مہینوں کا تعارف (زیر تکمیل)
44. آداب معاشرت
45. تلخیص احکام خداوندی
46. سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ (روزنامہ الفضل آن لائن لندن کے اوراق سے)
47. تبلیغ میں پریس اور میڈیا سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے (زیر تکمیل)
48. اے چھاؤں چھاؤں شخص (عابد خان صاحب کی ڈائری کے چند اوراق) (زیر تکمیل)
49. پھول ہمارے آنگن کے (ادارہ الفضل آن لائن کی تمام مطبوعات کا تعارف) (زیر تکمیل)

*****